ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

مئی ۲۰۱۹ء | جلد ۱۰ | شمارہ ۱۱ | رمضان ۱۴۴۰ھ

بانی: ڈاکٹر محمد غیاث صدیقی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

زیر سرپرستی

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی
(صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

زیر نگرانی

ڈاکٹر سعد ماحی
(سکریٹری علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن)

مجلس مشاورت

- مولانا سید سلمان الحسینی ندوی
- مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
- مولانا محمد الیاس ندوی بھٹکلی
- ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی
- محمد قمر عالم لکھنوی
- ڈاکٹر جمشید احمد ندوی
- مولانا محمد اخلاق ندوی

مدیر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی
tariqnadwialig@yahoo.co.in, Mob.9897776652

معاون مدیر

محمد فرید حبیب ندوی

مجلس ادارت

- پروفیسر مسعود خالد علیگ
- مجیب الرحمٰن عتیق ندوی
- محمد قمر الزماں ندوی

سرکولیشن انچارج

سعید احمد ندوی 9045616218
محمد آصف اقبال ندوی 9454210673

خط و کتابت کا پتہ:

مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، ہمدرد نگر ڈی، کوارسی بائی پاس علی گڑھ
e-mail: nidaeaetidal@gmail.com

شرح خریداری

فی شمارہ:	25:00روپے
سالانہ:	250:00روپے
سالانہ اعزازی ممبرشپ:	500:00روپے
بیرونی ممالک:	30$ ڈالر
لائف ممبرشپ (۲۰ سال):	4000:00روپے

Bank Acount Detail: Mr Saeed Ahmad Ansari
Acount No: 6561000100039197
IFSC code: PUNB0656100
Punjab National Bank, Medical Road, Aligarh-202002
Mob. 9808850029

Designed and composed by Abdur Rehman Naeem, Mob. 9546692993; email-arehman412@yahoo.in

Editor: Dr. M. Tariq Ayubi Nadwi

سعید احمد ندوی نے آئیڈیل گرافکس انٹر پرائزیز، علی گڑھ سے چھپوا کر دفتر علامہ ابوالحسن علی ندوی ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر فاؤنڈیشن، ہمدرد نگر ڈی، علی گڑھ سے شائع کیا

Printed & Published by Saeed Ahmad Nadwi behalf of the office of Allama Abul Hasan Ali Nadwi Educational & Welfare Foundation Hamdard Nagar-D, Jamalpur, Aligarh at Ideal Graphics Enterprises, Patwari Nagla, Aligarh

visit us: www.nadwifoundationaligarh.org

فہرست مضامین

۱۔	قرآن کا پیغام	رمضان میں دعاؤں کا اہتمام کریں	محمد عارف ندوی	
۲۔	اداریہ	سانحۂ نیوزی لینڈ-ایک تجزیہ	مدیر	۳
۳۔	استقبال رمضان	استقبال رمضان المبارک	حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	۱۵
۴۔	قند مکرر	رمضان ''ماہ قرآن'' کے طور پر گزاریئے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۱۱
۵۔	مطالعۂ شخصیات	فکر بوالحسن- کچھ گوشے	مولانا سید سلمان حسینی ندوی	۱۷
۶۔	تعلیم و تربیت	تربیت اولاد- چند اہم گوشے	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۲۵
۷۔	انکار حدیث	امام ابوحنیفہ اور ان کے اجتہادی اصول (قسط-۱)	محمد فرید حبیب ندوی	۳۵
۸۔	تاریخ	جنوبی ہند کی مسلم حکومتیں اور ان کے علمی و مذہبی رجحانات	ذیشان سارہ	۴۲
۹۔	احوال عالم	ایک دہشت گرد کی ڈائری سے	شان محمد ندوی	۴۹
۱۰۔	// //	چارلی ایبڈو اور مسجد نور	تحریر: سلیم عزوز، ترجمہ: محمد سہیل ندوی	۵۶
۱۱۔	تعارف و تبصرہ	ہندو محققین کا مطالعہ قرآن و سیرت	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۵۸
	// //	قرآن کا تصور عروج و زوال	// //	۵۹
	// //	مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی حیات و علمی خدمات	// //	۶۲
۱۲۔	آخری صفحہ	احسان کی تعریف اور اس کا صحیح مفہوم	م۔ق۔ن	۶۴
۱۳۔	شعر و ادب	غزل	----	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

سانحۂ نیوزی لینڈ-ایک تجزیہ

۱۵ مارچ ۲۰۱۹ء بروز جمعہ کو نیوزی لینڈ جیسے مامون و پُرسکون ملک میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو تاریخ انسانی میں اپنی سفاکی، بربریت، اسلام دشمنی اور انسانیت سوزی کے لیے ہمیشہ یاد کیا جائے گا، آسٹریلیا کے ایک سفید فام انتہا پسند، نسل پرست عیسائی دہشت گرد برینٹین ہیریسن ٹرانٹ (پ۱۹۹۱ء)Brenton Harrison Tarrant نے اپنی اسلام دشمنی میں اندھے ہوکر، حیوانیت سے مغلوب ہوکر مشین گن اٹھائی اور کرائسٹ چرچ نامی شہر کی دو مسجدوں کی طرف چل دیا، اس نے ڈرامائی انداز میں بلکہ بچوں کے کمپیوٹر کھیلوں کی طرح گولیاں برسانا شروع کر دیں اور نماز کے لیے مسجد میں موجود تقریباً ۵۰ مسلمانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا، اس پر اسلاموفوبیاIslamophobia کا ایسا بھوت سوار تھا کہ لاشیں گرتی رہیں اور وہ گولیاں چلاتا رہا، انسان کے درندہ بن جانے کا ثبوت پیش کرتا رہا، پوری دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کے ساتھ اس کا ویڈیو فیس بک پر لائیو ہوا، اس حیوانیت و درندگی سے بھرپور واقعہ کے بعد پوری دنیا دہل گئی، لوگوں میں سراسیمگی پھیل گئی، صف ماتم بچھ گئی، اس واقعہ کی جزوی تفصیلات سے قطع نظر اس سے متعلق بعض خاص پہلو ہیں جن کا دراصل یہاں تذکرہ کرنا مقصود ہے:

۱۔ یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟

اس واقعہ کے پیش آنے کے پیچھے متعدد عوامل و اسباب ہو سکتے ہیں، لیکن درحقیقت جو سب سے بڑا سبب نظر آتا ہے، وہ مستشرقین کی وہ ہرزہ سرائی، زہر افشانی اور تاریخ کو مسخ کرنے، مسلمانوں کی شبیہ کو خراب کرنے اسلام کو تشدد و ظلم سے جوڑنے کا سلسلہ ہے، جو انھوں نے صلیبی جنگوں میں شکست کے بعد شروع کیا تھا، انھوں نے اسلام کی امن پسندی کو مسخ کر کے اس کی ظالمانہ اور مستبدانہ تصویر پیش کی، مسلمان فاتحین Muslim Heroes کو بھیانک و خوفناک قسم کے ظالم و جابر اور وحشی کی حیثیت سے پیش کیا، اسلامی تاریخ کی ایسی وحشیانہ تصویر کھینچی کہ یورپ کی نئی نسل کے قلب و دماغ میں اسلام سے نفرت رچ بس جائے، اور وہ اس کے اوصاف حمیدہ کا مشاہدہ کرنے کے باوجود بھی اس سے متنفر ہو جائے، پروپیگنڈہ اس حد تک کیا گیا کہ ہر عام و خاص اس کی زد میں کسی نہ کسی حد تک آ ہی گیا اور بڑی حد تک یہ مہم کامیاب ہوگئی، بیسویں صدی کے آخری دہوں میں شعائر اسلامی کی پابندی کو بنیاد پرستی اور دہشت گردی سے جوڑ دیا گیا، باعمل مسلمان کو دہشت گرد کی نظر سے دیکھا جانے لگا، دہشت گردی کو جنم دے کر اس کو اسلام سے جوڑ دیا گیا اور مظلوموں کو ہی ہمیشہ دہشت گرد قرار دیا گیا۔

دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ یورپ کے یہود و نصاریٰ کی فطرت میں بنیاد پرستی داخل ہے، عنصریت ان کی فطرت ثانیہ رہی ہے، جو کسی نہ کسی رنگ میں ہمیشہ ہی ان دونوں قوموں میں پائی گئی ہے، چنانچہ پہلے تو یورپ میں مسلمانوں کو سیکورٹی کے لیے خطرہ قرار دیا گیا، ۹/۱۱ کے بعد یہ ذہنیت زیادہ عام ہوئی، اور اس سلسلہ میں بحثیں تیز ہوگئیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ۹/۱۱ کا ڈرامہ اسی

لیے اسٹیج کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کو کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے، ان کو جرم کے بغیر مجرم ہونے کے احساس میں اس طرح مبتلا کر دیا جائے کہ وہ اس احساس سے پھر باہر نہ نکل سکیں، لیکن دراصل اس ڈرامہ کے پیچھے جو ذہنیت کارفرما تھی وہ نسل پرستانہ، متعصّبانہ اور اسلام دشمنی پر مبنی ذہنیت کارفرما تھی، مغرب کو اصل خطرہ دہشت گردی سے نہیں ہے، بلکہ ان کو حقیقی خطرہ اسلامی تہذیب وثقافت سے ہے، گزشتہ دو صدیوں کا اگر جائزہ لیا جائے بالخصوص خلافت عثمانیہ کے خاتمہ (۱۹۲۴ء) کے بعد سے اب تک کا جائزہ لیا جائے تو مسلمانوں نے دن بہ دن تنزلی کا سفر طے کیا ہے، مغرب سیاسی، معاشی، فوجی اور علمی اعتبار سے روز بہ روز ترقی کی نئی منزلیں طے کرتا رہا اور مسلمان روز افزوں تخلف کا شکار ہوتے رہے تا آنکہ پورے عالم اسلام پر مغرب نے سیاسی، فکری، تعلیمی اور معاشی اعتبار سے مکمل تسلط حاصل کر لیا، اسپین میں جب مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی تو بڑی تعداد مین مسلمان عیسائی بنا لیے گئے تھے، مغربی ممالک کی طرف ہجرت کرنے والے مسلمانوں کو سہولیتیں فراہم کر کے عیسائی بنا لیا گیا تھا، لیکن ان سب چیزوں کے باوجود مسلمانوں کا بڑا طبقہ اپنی تہذیب وثقافت کو گلے سے لگائے رہا، گذشتہ منظر نامہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے مغربی ممالک میں مسلمانوں کو روزگار کے مواقع فراہم کیے گئے، دن بدن یورپی ممالک میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی رہی، مسلمانوں کا یہ خاصہ رہا ہے کہ وہ جہاں رہتے ہیں، بڑی حد تک اپنے شعار کو سینے سے لگا کر رکھتے ہیں، اسلامی تہذیب وثقافت کی یہ ایک ایسی نمایاں خصوصیت ہے جس کی مثال مشکل سے ملے گی، علاقائی ونسلی وخاندانی رہن سہن اور لباس وتہذیبی رویّوں میں نمایاں فرق کے باوجود بھی مسلمان جہاں بستے ہیں اپنے بعض شعائر کی وجہ سے وہ پہنچان لیے جاتے ہیں، ایسے مشترک اقدار ہوتے ہیں جو بہر حال ہر جگہ اور ہر ملک کے باشندوں میں پائے جاتے ہیں، تہذیبوں کے ٹکراؤ سے خائف یورپ اور اس ٹکراؤ میں بالآخر امریکی تہذیب کی بالادستی کا خواب دیکھنے والے انتہا پسند سفید فام نسل پرستوں کے لیے مسلمانوں کا اپنی تہذیب کے ساتھ ان کے ملکوں میں رہنا انھیں کہاں برداشت ہوسکتا ہے، جبکہ وہ خود مسلم ممالک میں رفتہ رفتہ مسلمانوں سے ان کی تہذیب چھین لینے کے لیے کوشاں ہیں، وقتاً فوقتاً کسی مسلمان پر حملہ، کسی مسجد پر حملہ، کسی پردہ پوش کے حجاب کو نوچنے، کسی عفت مآب خاتون کی بے عزتی کرنے، مسلمانوں کو مشکوک نظر سے دیکھنے کے جو اکّا دُکّا واقعات پیش آتے تھے، وہ دراصل اسی نسل پرستانہ ذہنیت وعصبیت کا نتیجہ ہوتے تھے، جس کا بھیانک ترین نتیجہ اب اس واقعہ کی شکل میں رونما ہوا، اسلاموفوبیا کے پروپیگنڈے سے اگر جنگ نہ کی گئی، مغرب کی عنصری ذہنیت کو اگر بے نقاب نہ کیا گیا تو اب ان واقعات میں مزید اضافہ ہوگا، اتفاق سے جس وقت یہ تحریر لکھی جا رہی ہے عین اسی وقت کیلی فورنیا امریکہ سے ایک مسجد کو آگ کے حوالے کرنے کی خبریں آرہی ہیں، اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے کہ مغرب میں دوغلا پن عام بات ہے، اس کا ہر معیار دوہرا ہے، جو لوگ اس کے خوبصورت کھوکھلے نعروں کے فریب میں مبتلا ہیں ان کو اس واقعہ پر مغربی دنیا کے ردّعمل سے سبق سیکھ لینا چاہیے اور اب حقیقت سمجھ لینا چاہیے۔

۲۔ ردعمل:

اس واقعہ کے متصلا بعد جو ردعمل ہونا چاہیے تھا وہ نہ مسلم ممالک کی طرف سے ہوا اور نہ ہی مغربی ممالک کی طرف سے، مسلم ممالک پیرس حملہ پر تو اظہار تعزیت کر سکتے ہیں، (اور کرنا بھی چاہیے) ماتم کی مجلسیں منعقد کر سکتے ہیں، لیکن مغرب کے یہ غلام نیوزی لینڈ میں پیش آئے اس واقعہ پر کوئی مضبوط متحدہ موقف کیا اختیار کرتے، ان سے تو یہ بھی نہ ہوسکا کہ وہ اس واقعہ کو نسل پرستانہ اور انتہا پسندانہ ذہنیت کی نقاب کشائی کے لیے اور مسلمانوں پر سے تشدد دہشت گردی کا الزام ہٹانے کے لیے ایک مہم بنا دیتے،

بلکہ ایسا محسوس ہوا کہ جس طرح مغرب اس واقعہ کو دبا دینا چاہتا تھا اسی طرح مسلم ممالک بھی اس میں برابر کے شریک تھے، برائے نام اظہار تعزیت بہت سے لوگوں نے کیا۔

مغربی ممالک نے اس واقعہ کو اس طرح لیا کہ گویا کوئی اہم حادثہ ہوا ہی نہیں، خدانخواستہ اگر معاملہ برعکس ہوتا تو مغربی میڈیا میں بھونچال آجاتا، پورا مغرب بیک زبان ''اسلامی دہشت گردی'' اور ''مسلم دہشت گرد'' کے نعرے لگاتا اور پوری دنیا کو پھر ظلم سے بھر دیتا، مگر یہاں تو موت کا سا سناٹا تھا، کسی نے بھی اس کو دہشت گردی نہیں کہا اور اگر دہشت گردی کہا تو مذہبی دہشت گردی یا مسیحی دہشت گردی کہنے سے مکمل طور سے گریز کیا، یورپ کیا! بھارت میں بھی ایک ذہنیت یہ نظر آئی جس نے اس بہیمانہ قتل عام پر خوشیاں منائیں، رواداری کی ہر قسم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مسلمانوں کو گالیاں دیں، طعنے دیے، ان کی مظلومیت کا مذاق اڑاتے ہوئے یوں کہا کہ بس اتنے ہی مارے گئے، کسی نے بھی اس پر اس طرح کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا کہ جو مغرب میں ایک کتے کے بھی قتل پر کیا جاتا ہے، چہ جائیکہ اس کو واضح لفظوں میں بنیاد پرستی، نسل پرستی، مذہبی و مسیحی دہشت گردی سے تعبیر کیا جاتا، جبکہ وحشی مجرم نے ذرہ برابر بھی اظہار افسوس و ندامت نہ کیا، بلکہ اس نے اپنی گن (Gun) پر جو جملے لکھ رکھے تھے وہ اس کی خطرناک اور مجرمانہ ذہنیت کو سمجھنے کے لئے کافی تھے، تاریخ کی غلط بیانیوں نے اسے کس قدر انسانیت دشمن بنا دیا تھا، یہ اس کے وہ جملے بیان کرتے ہیں جو اس نے بندوق پر لکھ رکھا تھا، اس نے اپنے اس جملہ کو ویانا (Vienna) کی جنگ کا انتقام قرار دیا، اس نے سیاحوں اور مہاجروں کو مخاطب کر کے کہا کہ تمہیں جہنم میں آنا مبارک، اس نے موجودہ استنبول کو قسطنطنیہ میں تبدیل کرنے کے عزم کا بھی اظہار کیا، مغرب کی دوہری پالیسی کے باوجود انصاف کی مثالیں بھی سامنے آئیں، انتہا پسندی اور نسل پرستی کے خلاف پُرامن مظاہرے بھی ہوئے، اور یہ بات واضح ہوگئی کہ منصفانہ اقدار ابھی بھی دنیا سے یکسر ختم نہیں ہوئی ہیں، خود وحشی آسٹریلیائی مجرم کی ماں کا ویڈیو بہت وائرل ہوا، جس سے سوال کیا گیا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں، اس سے پوچھا گیا کہ اس کے بیٹے کو کیا سزا ملنی چاہیے، تو اس نے صاف کہا کہ وہ اپنے جرم کے بدلہ سزائے موت کا مستحق ہے، مغرب عام طور پر اس طرح کے حملہ آوروں کو ذہنی مریض قرار دے کر دامن جھاڑ لیا کرتا ہے، مگر اس بار وہ حملہ آور کی منظم اور وحشیانہ کارروائی کو اس طرح کا نام تو نہ دے سکا البتہ صراحت کے ساتھ اس نے مسیحی دہشت گردی بلکہ دہشت گردی کے الفاظ استعمال کرنے سے بھی گریز کیا۔

۳۔ حکومت نیوزی لینڈ کا خیرخواہانہ موقف:

اس کربناک واقعہ کے بعد حکومت نیوزی لینڈ بالخصوص وہاں کی وزیر اعظم جسینڈا آرڈرن Jacinda Ardern نے جو موقف اختیار کیا اور جو اقدامات کیے وہ قابل تعریف اور لائق ستائش ہیں، جسینڈا آرڈرن نے مسیحی مظالم کی تاریخ کو اپنے خیرخواہانہ موقف اور جذبۂ رواداری کے ذریعہ جھٹلا دیا، مسیحی دنیا کی بے رحم نسل پرستانہ تاریخ اور مغرب کے ظالمانہ رویّوں سے ہٹ کر ایسا موقف اختیار کیا جس سے ہر طرف ان کی تعریف کی گئی، یہ الگ بات ہے کہ ایسا موقف اختیار کرنے کے بعد سے وہ مسلسل انتہا پسند گوروں اور نسل پرستوں (Racist) کے نشانے پر ہیں، مسلسل ان پر تنقیدیں کی جارہی ہیں، انھیں دھمکیاں دی جارہی ہیں، مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، لیکن وہ قابل تعریف ہیں کہ پوری جرأت سے اس صورت حال کا مقابلہ کر رہی ہیں، انھوں نے جس طرح مسلمانوں کے دکھ درد کو بانٹا، ان کے ساتھ اظہار یکجہتی کی اور رواداری کا جو مظاہرہ کیا اس کو تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، بقول ترک صدر رجب طیب اردوغان مغرب کو نیوزی لینڈ کی وزیر اعظم سے سبق حاصل کرنا چاہیے،

نیوزی لینڈ کی وزیر اعظم نے واقعی عوام اور مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہوکر انسانیت اور انسانی اقدار سے بے بہرہ یورپ کو انسانیت کا درس دیا ہے، نیوزی لینڈ کی وزیر اعظم کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حملہ کے فوراً بعد پریس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے مغربی رُت کے برخلاف اس واقعہ کو ''دہشت گردی'' سے تعبیر کیا، ان کی اس جرأت کو جس قدر سراہا جائے کم ہے، انھوں نے متاثر خاندانوں سے ملاقاتیں کیں، عورتوں اور بچوں کو گلے لگایا، انھوں نے رواداری کا ثبوت پیش کرتے ہوئے اور یکجہتی کے لیے مسلمانوں سے ملاقات کے وقت مشرقی مسلم خواتین کی طرح شلوار قمیص اور دوپٹہ کو زیب تن کیا، پارلیمنٹ کے اجلاس کا آغاز تلاوت قرآن سے کیا، نہ صرف مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانے کے عزم کا اظہار کیا بلکہ اس حملہ کے پس پردہ کرداروں کو منظر عام پر لانے کا وعدہ کیا، انھوں نے اس کی تحقیقات کے لیے شاہی کمیشن بھی تشکیل دیا، انھوں نے دوسرے جمعہ کو سرکاری سطح پر سوگ منانے کا اعلان کیا، پورے ملک میں ۲ منٹ کی خاموشی اختیار کرنے کی اپیل کی، جمعہ کے روز سرکاری ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اذان نشر کرنے اور خواتین کو ڈوپٹہ سر پر رکھنے کا حکم دیا، عوام نے بھی بڑے پیمانے پر اپنی لیڈر کی تقلید کی، دل کھول کر مسلمانوں کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کیا اور ان کے دکھ درد میں شریک ہوئے، نیوزی لینڈ کے اس موقف سے دنیا بھر کے درندوں کو بہت مثبت اور واضح پیغام دیا گیا، وزیر اعظم کی خیر خواہی اور رواداری نے ایک مسلم نوجوان کو اس حد تک موقع فراہم کیا کہ اس نے انھیں قبول اسلام کی دعوت پیش کردی، محترمہ جسینڈا نے بغور اس کی گفتگو سنی اور جواب میں عرض کیا کہ ''میرا خیال ہے کہ میں نے وہی کیا جس کا حکم حضرت محمدؐ نے دیا ہے اور جس کا سبق اسلام سکھاتا ہے''، انھوں نے اپنی ایک تقریر کا آغاز بھی حضورؐ کی ایک مشہور حدیث سے کیا جو بہر حال تعصب ونفرت انگیزی کی دنیا میں ایک مثبت پیغام ہے، ہم تو بس یہی دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کو ہدایت دے اور ان کے سینہ کو اسلام کے لیے کھول دے اللهم اهدها إلى صراطك المستقيم واشرح صدرها للاسلام۔

۴۔ ترکی کا مضبوط مثالی اور اقدامی موقف:

ترک حکومت اور اس کے سربراہ رجب طیب اردوغان نے اس موقع پر جو موقف اختیار کیا، وہ اسلامی غیرت، ملی شعور اور قائدانہ کردار کا عکاس ہے، اردوغان نے ایک عرصہ سے ''دفاع'' کو عنوان بنا کر اقدامی پالیسی اختیار کر رکھی ہے، سانحۂ نیوزی لینڈ کے بعد انھوں نے پورے طور سے اقدامی موقف کا اظہار کیا، مغرب نے عرصہ سے جو نظریاتی جنگ (Ideological war) چھیڑ رکھی تھی، اس سانحہ کے بعد اردوغان نے کمالِ حکمت سے وہی جنگ مغرب پر مسلط کردی، اسی کے لیے انھوں نے اس دہشت گردانہ کاروائی کے ویڈیو کو محفوظ کیا، اسے عوامی انتخابی ریلی میں دکھایا اور تابڑ توڑ اقدامی بیانات جاری کیے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ نظریاتی جنگ میں مغرب اپنی شکست کو کسی حال میں قبول نہ کر سکے گا، بلکہ اسے تو بیک فٹ پر رہنا بھی گوارہ نہ ہوگا، کیوں کہ وہ ساری تگ ودو ہی نظریاتی بالادستی کے لیے کرتا آیا ہے، اس لیے یہ بھی خدشہ ہے کہ جلد ہی مغرب ہتھے سے اکھڑ جائے گا، جس کی کوشش وہ مختلف سطح پر متعدد بار کر چکا ہے۔

دنیا کے تمام مسلم ممالک کے برخلاف ترکی نے اس واقعہ پر اقدامی رخ اختیار کیا، اس واقعہ کو عالمی سطح پر اٹھایا، صہیونیت وصلیبیت پر اس واقعہ کی ذمہ داری بابانگ دہل عائد کی، دنیا کے معتبر ترین صحافیوں اور بڑے بڑے مفکرین نے ترکی کے موقف کی ستائش کی، اور اس کو مضبوط ترین موقف قرار دیا، واقعہ کے معاً بعد اردوغان نے یہ بیان دیا کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کھلی ہوئی دشمنی کی مثال ہے، انھوں نے اس حملہ کو انفرادی کارروائی نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف منظّم سازش اور منظّم حملہ قرار

دیا، انھوں نے کہا کیا یورپ میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ وہ اس کو ''مسیحی دہشت گردی'' قرار دے، انھوں نے صاف طور پر کہا کہ یا تو مغرب دہشت گردی کو اسلام سے جوڑنے سے باز آئے یا پھر اس کے لیے تیار ہو کہ اس واقعہ کو مسیحی دہشت گردی سے تعبیر کرے، انھوں نے اس موقع پر پوری جرأت کے ساتھ اسلاموفوبیا Islamophobia کے پروپیگنڈے کے خلاف جنگ چھیڑنے کا اعلان کیا، اور واضح الفاظ میں یہ پیغام دیا کہ اسلام کے ساتھ دہشت گردی کو جوڑنے کی مہم کے خلاف ہم اعلان جنگ کرتے ہیں، انھوں نے مغرب کو جسینڈا آرڈرن سے عبرت حاصل کرنے کی نصیحت کرتے ہوئے یہ بھی دعوت دی کہ وہ نسل پرستی کے عنصر کا خاتمہ کرے ورنہ اس طرح کے حملوں پر قابو نہ پا سکے گا۔

اردوغان نے قائد ملت کی حیثیت سے فوری طور پر نائب صدر اور وزیر خارجہ پر مشتمل وفد کو نیوزی لینڈ بھیجا، اس وفد نے نیوزی لینڈ کی وزیر اعظم کے موقف کی تائید وستائش کی، جائے واردات کا معائنہ کیا، متاثر خاندانوں سے ملاقاتیں کیں، شہداء کے جنازوں میں شرکت کی، اردوغان نے تقریباً اپنے ہر بیان میں جسینڈا آرڈرن کے موقف کی صراحت کے ساتھ تعریف کی، اور مغرب کو ان سے انسانیت کا سبق دیکھنے کی تلقین کی، انھوں نے بار بار اور ہر موقع پر جسینڈا آرڈن کے ہر بیان اور ہر اقدام کی بھرپور تعریف کی اور لائق ستائش قرار دیا، انھوں نے اس حادثہ کے بعد ایک دور اندیش سیاست داں کی طرح اس کو مغرب کے پروپیگنڈوں کے خلاف استعمال کیا اور اس واقعہ کو لے کر کامیاب سفارتی وسیاسی حکمت عملی کا ثبوت دیا، خود بیانات جاری کیے، پارلیمانی بیان آیا، مذہبی امور کے چیئرمین، وزیر خارجہ، صدارتی ترجمان، پارٹی ترجمان سمیت مختلف سطح پر بیانات جاری کیے گئے، پورے ملک میں اس کے خلاف مظاہرے ہوئے، جب مغرب ہر جگہ سے اس ویڈیو کو ہٹا رہا تھا تو ترکی نے کمالِ مہارت سے ایک سافٹ ویئر ڈیول اپ کر کے اس پر اپ لوڈ کیا، پھر ایک عوامی انتخابی ریلی میں جب اردوغان نے اس ویڈیو کو دکھایا تو مغرب کے ہوش اڑ گئے، مغرب نے اس پر احتجاج کیا، اسی طرح اردوغان کے اس بیان پر اعتراض کیا کہ ''اگر تم استنبول پر حملہ کے لیے آئے تو ہم تم کو ویسے ہی تابوت میں واپس کریں گے یا یہیں دفن کر دیں گے، جیسے تمہارے آباء واجداد کے ساتھ کیا تھا''، اردوغان کے اس بیان کا پسِ منظر معلوم نہ ہو تو مغرب کے ماتم اور پروپیگنڈہ سے متاثر ہونا بہت آسان تھا، مگر اردوغان نے پوری دلیری سے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور بار بار دوہرایا کہ ''استنبول اب تا قیامت اسلامی شہر رہے گا، یہ ہماری گردنوں میں ابوایوب انصاریؓ اور عثمانیوں کی امانت ہے، یہ اب کبھی قسطنطنیہ نہیں ہوسکتا، یہ سب ردعمل تھا اس وحشی مجرم کے اس عزم کا جس کا اس نے اپنی تحریر میں اظہار کیا تھا کہ ہم عنقریب استنبول پر حملہ کر کے اس کو اس کی قدیم حیثیت پر واپس لائیں گے اور اسے قسطنطنیہ بنائیں گے، اس نے اپنے ۷۴ صفحاتی نوٹ میں اردوغان کے قتل کی بھی اپیل کی تھی، واضح رہے کہ استنبول بازنطینی سلطنت کا پایہ تخت تھا، وہاں موجود مسجد آیا صوفیا (موجودہ میوزیم) اشبیلیہ کا چرچ بننے سے پہلے ایک ہزار سال تک مسیحی دنیا کا سب سے بڑا چرچ تھا، عثمانیوں نے قسطنطنیہ کی فتح کے بعد اسے مسجد میں تبدیل کر دیا تھا، اتاترک نے اپنے استبدادی تسلط کے بعد اسے میوزم میں تبدیل کر دیا، عثمان پاشا کے بنائے ہوئے اس کے منارے ہمیشہ ہی مسیحی دنیا کے دلوں میں چبھتے رہے ہیں، اردوغان نے اپنے حالیہ بیان میں اسے مسجد کی حالت میں دوبارہ تبدیل کرنے کا اعلان بھی کیا ہے، اردوغان کی مضبوط وطاقت ور حکمت عملی اور کامیاب میڈیائی وسفارتی مہم کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ نظریاتی اور سیاسی مدمقابل نے بھی دو روز بعد بیان جاری کیا اور مسلمانوں کے اس قتل عام پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ''نیوزی لینڈ میں جو گولیاں برسائی گئی ہیں، وہ ہمارے جسموں میں پیوست ہوئی ہیں''، یہ اسی کمالسٹ پارٹی کے نمائندہ کا بیان ہے جس کی پارٹی کی بنیاد میں مسلم دشمنی اور اسلام کی مخالفت شامل ہے، مگر تبدیلی جب آتی ہے تو وہ سب کچھ تبدیل کر دیتی

ہے، جس ترکی میں کمالسٹ حجاب کی حمایت کے سبب حکومت کا تختہ تک الٹ دیا کرتے تھے، اسی ترکی میں گزشتہ صدارتی انتخابات میں یہ منظر بھی دیکھا گیا تھا کہ کمالی نمائندہ اپنی بیوی کو اسکارف پہنا کر عوامی ریلی کے دوران اسٹیج پر لایا تھا، یہ تھی ترک قیادت کے ذریعہ مضبوط تبدیلی کی دلیل، اردوغان نے اس موقع پر اسلامی تعاون تنظیم کا ایمرجنسی اجلاس بھی طلب کیا اور اس میں نیوزی لینڈ کے وزیر خارجہ کو بھی مدعو کیا، اس سانحہ کے متعلق وہاں بحث کی گئی اور مضبوط و متحدہ موقف اختیار کرنے کی دعوت دی گئی، اس پورے منظر نامہ میں ترکی کا کردار انتہائی مثبت اور موقف بہت مضبوط رہا ہے، اس نے پورے طور پر بیدار مغزی، ملی اور سیاسی شعور کا ثبوت دیا ہے۔

۵۔ ایک رویہ یہ بھی:

باوجود اس کے کہ وحشی مجرم نے مسجد میں داخل ہونے کے بعد کسی سے یہ نہیں پوچھا کہ اس کا مسلک کیا ہے یا کون کس مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے، اس نے تو صرف سب کو مسلمان سمجھ کر ان کے سینوں میں اندھا دھند گولیاں پیوست کر دیں، بقول حفیظ میرٹھی مرحوم ؎

ننگِ اسلام تھا لیکن یہ مری خوش بختی
مجھ کو مارا ہے مسلمان سمجھ کر آقا

مسلمانوں کے وجود کو گولیوں کی باڑ پر رکھ دیا گیا ہے، مگر پھر بھی وہ مسلکی عصبیت اور فکری کشمکش سے دامن چھڑانے کو تیار نہیں، جس وقت سوشل میڈیا پر بعض ناعاقبت اندیش بدبختوں کی اس طرح کی پوسٹ نظر سے گذری کہ ''حملہ آور ترکی سے ٹریننگ لے کر آیا تھا، حملہ آور اخوانیوں کی فکر کے ردعمل میں یہ سب کر گیا'' تو بخدا آنکھیں پتھرا گئیں، یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ کوئی مذہبی شخص تعصب میں اس قدر اندھا کیسے ہو سکتا ہے، وہ مسلمانوں کے موقف کو کمزور کرنے پر کیسے آمادہ ہو سکتا ہے، وہ ملت کے مقدمہ کو کمزور کرنے پر کیسے راضی ہو سکتا ہے، وہ محض فکری اختلاف کے سبب کسی کلمہ گو پر الزام تراشی کیسے کر سکتا ہے؟، مگر ہائے افسوس آج خلیج کی محبت اور ترک دشمنی میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے، حقائق کو پسِ پردہ رکھ کر خبروں کو توڑنے اور پروپیگنڈے کرنے کا منافقانہ کردار پیش کیا جا رہا ہے، جس پر قرآن مجید نے مختلف انداز سے منافقین کی سرزنش کی ہے، کچھ بھولے بھالے ایسے بھی نظر آئے جو پارلیمنٹ میں جن قاری صاحب کو تلاوت کا موقع ملا ان کے دیوبندی ہونے پر مست و مگن تھے اور اسی کو نرا اعزاز سمجھ کر خوشیاں منا رہے تھے، یہ سب زوال پذیر قوم کے ذہنی و فکری دیوالیہ پن کی دلیلیں ہیں، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کے افراد کے پاس نہ کوئی مشن بچا ہے اور نہ وزن، نہ اس کے پاس منصوبے ہیں اور نہ تربیت یافتہ افراد، بس یہی چند کھوکھلے نعرے اور منافقانہ کردار ہیں جن کے سہارے یہ سب باہم دست و گریباں رہتے ہیں، اور اسی دھاچوکڑی کو اپنے لیے معراج کمال سمجھتے ہیں۔

۶۔ ایک نظر اس پر بھی:

یقیناً نیوزی لینڈ کا سانحہ کسی خوفناک خواب سے کم نہ تھا جس کا حقیقت میں مشاہدہ کیا گیا، اس پر حکومت نیوزی لینڈ کی رواداری کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے، لیکن اس موقع پر اس کو مسلمانوں کے لیے سبق آموز قرار دینا راقم کی نظر میں درست رویہ نہیں، اس لیے کہ مسلمانوں کی تاریخ جنگی اخلاقیات کو برتنے اور مذہبی رواداری کی بہترین مثالیں پیش کرنے سے بھری پڑی

ہے، بلکہ اب تو وہ رواداری سے آگے بڑھ کر فکری غلامی کے مرحلہ میں داخل ہو چکے ہیں، اب ان کی حالت یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ حادثہ ہو تو اظہارِ غم کے لیے وہ ہر طریقہ اپناتے ہیں، اور مظلوم کے شانہ بشانہ کھڑے ہو جاتے ہیں، مگر نیوزی لینڈ میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا تو کتنے مسلمانوں نے مظاہرہ کیا، کتنے لوگ اظہارِ یکجہتی کے لیے وہاں پہنچے، ظاہر ہے کہ جو بے چارے مصر و شام کے قتل عام پر خاموش رہے، جن کے دلوں میں روہنگیا اور اویغور کی نسل کشی سے اضطراب نہ ہوا، ان پر ان پچاس مسلمانوں کی شہادت کا کیا اثر ہوگا، جو مسجد اقصیٰ کے اردگرد روز ہونے والی شہادتوں کو نظر انداز کرتے ہیں ان کے دل میں اس واقعہ سے کیوں ہُوک اٹھے گی، پیرس حملہ میں ہوئے دہشت گردانہ واقعہ پر واویلا مچانے والوں کو چاہیے تھا کہ سانحہ نیوزی لینڈ پر آسمان سر پر اٹھا لیتے اور پوری قوت سے یہ باور کراتے کہ دہشت گردی تو دہشت گردی ہے، اس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر افسوس ذہنی غلامی اور مصلحت پسندی نے اس کی اجازت ہی نہ دی، البتہ نیوزی لینڈ کی سربراہِ حکومت سے مسلم حکمرانوں کو یہ سیکھنا چاہیے کہ اپنے عوام کے ساتھ کس طرح سلوک کرنا چاہیے، ان کے جذبات کا کیسے خیال رکھنا چاہیے اور کس طرح ان کے دل جیتنا چاہیے، اسی طرح حکومت نیوزی لینڈ کے موقف کو ان لوگوں کے لیے نمونہ قرار دینا چاہیے، جن کی تاریخ بہیمانہ وارداتوں، مذہبی منافرت، عدم برداشت انتہا پسندی اور نسل پرستی کے سبب بے رحمی اور وحشیانہ کارروائیوں سے بھری پڑی ہے۔

اس موقع پر مذہبی طبقہ اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد نے کھل کر ردعمل کا اظہار کیا، اور اس حملہ پر اپنی بے چینی، کرب و درد کو ظاہر کرنے والے بیانات دیے، مگر افسوس کہ یہی لوگ اس سے زیادہ بھیانک دہشت گردانہ کارروائیوں پر خاموش تماشائی بنے رہے جو کارروائیاں ایک عرصہ سے مسلم ممالک میں مسلم حکمراں کر رہے ہیں، مصر و سعودیہ اس سلسلہ میں سرفہرست ہے۔

کاش مسلمانوں نے عالمی پیمانے پر اس طرح کے کرب کا اظہار اس وقت کیا ہوتا جب مصر میں نہتے نمازیوں اور روزہ داروں پر دن دہاڑے گولیوں کی بوچھار کی گئی تھی، میدان رابعہ کو قبرستان میں تبدیل کر دیا گیا تھا، مسجد رابعہ کو آگ کے حوالے کر دیا گیا تھا، بے گناہوں کے بے دریغ قتل کے بعد اب تک جیل میں بند لوگوں کی مظلومانہ پھانسی کا سلسلہ جاری ہے، خود سعودیہ میں ہزاروں علماء کو پسِ دیوار زنداں ڈال دیا گیا ہے، کتنوں کو غائب کر دیا گیا ہے، کتنوں کو ٹارچر کیا جا رہا ہے، طاغوت وقت کی شیطنت کی تائید فرض قرار دی گئی ہے، اس کی مخالفت میں کسی بھی طرح کے جبر و تشدد کو روا رکھا گیا ہے، جس کا انکشاف خود امریکہ کے خفیہ اداروں نے کیا ہے، کیا لوگوں کو یہ واقعات ہلکے پھُلکے لگتے ہیں، کیا وجہ ہے کہ ان وحشیانہ مظالم پر رگِ غیرت نہیں پھڑکتی، کلیجہ منہ کو نہیں آتا؟ علَم احتجاج بلند نہیں کیا جاتا؟ کہاں کھو جاتا ہے ملی شعور؟ کہاں گم ہو جاتے ہیں دینی غیرت کے حوالے اور احقاق حق کے دعوے؟ اپنوں کے مظالم سے ہی دوسرے شہہ پاتے ہیں اور ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں تو ان سے پھر شکوہ کیسا؟ پہلے اپنوں کا گریبان پکڑیے، ان کے رخ سے نقاب الٹیے اور پھر دوسروں پر توجہ کیجئے!!

۷۔ نتیجہ اور لائحہ عمل:

سانحہ نیوزی لینڈ کے بعد ایک بار پھر مطالعہ اسلام کا شوق بڑھنے کی خبریں آ رہی ہیں، بلکہ بعض ذرائع کے مطابق اس واقعہ کے بعد تقریباً چار سو افراد اسلام میں داخل ہو چکے ہیں، دنیا نے یہ منظر دیکھا کہ مسلمانوں نے جب نماز ادا کی تو نیوزی لینڈ کے عوام نے علامتی طور پر ان کی حفاظت کے عزم کا اظہار کیا، یہ بھی بڑا خوش آئند منظر تھا کہ دوسرے جمعہ کو جب اذان کی آواز فضا میں گونجی تو نہ صرف عوام بلکہ بہت سے سرکاری اور تعلیمی اداروں کے لوگ اذان کے احترام میں باہر نکل کر کھڑے ہو گئے اور انھوں

نے اظہار یکجہتی کے لیے دومنٹ کی خاموشی بھی اختیار کی، ظاہر ہے کہ یہ وہی اذان کی آواز تھی جس کو دبانے کے لیے عہد نبوی میں مدینہ کا محاصرہ کیا گیا تھا، کفار عرب نے اپنے اختلافات بالائے طاق رکھ کر ایک بڑے الائنس کے ساتھ مدینہ کی سرزمین میں اسلام کی آواز کو دفن کرنے کے لیے پوری طاقت جھونک دی تھی، اسی آواز کو دبانے کے لیے صلیبی جنگیں برپا کی گئیں، اسی آواز کو دبانے کے لئے روس وفرانس وبرطانیہ نے مل کر خلافت عثمانیہ کے حصے بخرے کر دیے، اسی آواز کو ختم کرنے کے لئے روس نے مظالم کے پہاڑ توڑے، امریکہ نے علی الاعلان اس اذان والے مذہب اسلام کو اپنا دشمن اور اپنے لیے خطرہ قرار دیا، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ مذہب آیا ہی ہے پھلنے پھولنے اور پھیلنے کے لیے، اس مذہب کی تاریخ یہ رہی ہے کہ اس پر ہر حملہ اس کی اشاعت میں معاون بن جاتا ہے، دشمن کی ہر چال اس کے گلے کا پھندا بن جاتی ہے، یہ وہ اذان ہے جس کی آواز نہ کبھی روکی جاسکی ہے، اور نہ کبھی دبائی جاسکے گی، جسے یقین نہ ہو وہ اسپین، روس اور ترکی کی معاصر تاریخ کا بغور مطالعہ کرلے۔

ضرورت اس بات کی ہے اس اعتماد ویقین کے ساتھ کہ یہ دین اللہ نے پوری انسانیت کے لیے رحمت اور بقا کی ضمانت کے طور پر اتارا ہے، اس دین کو غلبہ کی بشارت دی گئی ہے، اس دین متین کے ماننے والوں کو یہ بتایا گیا ہے کہ اگر وہ شرک سے گریز کریں گے، وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کریں گے تو ان کو اس زمین میں استحکام عطا کیا جائے گا، غلبہ وقوت وشوکت ان کا مقدر بنے گی، ضرورت ہے کہ ان بشارتوں پر یقین کرتے ہوئے پوری قوت کے ساتھ اسلام کی دعوت کو نہ صرف قول سے پیش کیا جائے، بلکہ کردار وعمل کے ذریعہ اسلامی تعلیمات کی مؤثر ترجمانی کی جائے۔

اسی کے ساتھ ساتھ مغربی پروپیگنڈوں کا پول کھولنے کی مہم چھیڑی جائے، مسخ شدہ تاریخی حقائق کو چھوٹے چھوٹے رسائل کے ذریعہ مثبت اور دعوتی اسلوب میں پیش کیا جائے، اس مہم میں علمی معیار سے بالکل بھی سمجھوتہ نہ کیا جائے، تاریخ کے حوالے سے عام کی گئی غلط فہمیوں کا ازالہ از حد ضروری ہے، اسلامی تاریخ میں موجود مذہبی رواداری اور جنگی اخلاقیات کی عدیم المثل نظیروں کو دنیا کی ہر زبان اور ہر قوم کے سامنے پیش کرنا ضروری ہے، اس کام کی جتنی ضرورت عالمی پیمانے پر ہے، اتنی ہی ضرورت خود ہمارے وطن عزیز میں بھی ہے، نفرت کی پوری عمارت ان ہی تاریخی غلط فہمیوں، مسخ شدہ حقائق اور پروپیگنڈوں پر کھڑی کی گئی ہے، ضرورت ہے کہ کوئی ادارہ اس کی ذمہ داری لے اور اس طرح کے رسائل بڑی تعداد میں متعدد زبانوں میں عام کرے، ان رسائل کا حجم بہت کم، علمی معیار بہت بلند اور اسلوب عام فہم ہونا ضروری ہے، اس قومی وملی فریضہ میں اداروں اور تنظیموں، اہل قلم اور سرمایہ داروں کو اپنے اپنے حصے کی خدمات پیش کرنے کے لئے آگے آنا چاہیے، ہمارے ذمہ کوشش وعمل ہے، دلوں کی تبدیلی رب اللہ کو قدرت ہے، ہم اپنی خدمات پیش کریں، دعوتی مہم چھیڑیں اور غلط فہمیوں کا ازالے کا سامان فراہم کریں، امید قوی ہے کہ اللہ کی طرف سے ہماری کوششوں سے زیادہ تبدیلی کے فیصلے ہوں گے، وما ذلك على الله بعزيز۔

(ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی)

❑ استقبال رمضان

استقبال رمضان المبارک

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی
استاذ و مفتی جامعہ دارالسلام، عمرآباد

خوش آمدید: اے رمضان مبارک:

ارشاد باری تعالی ہے یَـٰٓأَیُّهَا الَّذِینَ اٰمَنُوا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَى الَّذِینَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ . ترجمہ: اے مومنو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تا کہ تم پرہیز گار بنو۔(۱۸۳۔سورۃ البقرہ)

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر واحسان ہے جس نے ہمیں ایک اور بار رمضان کریم کا استقبال کرنے اور اس کی سعادتوں سے مالامال ہونے کا موقع عنایت فرمایا۔اللہ کرے کہ یہ زریں موقع ہمیں بار بار ملے اوراس سے کماحقہ مستفید ہونے کی توفیق نصیب ہو،آمین۔

حدیثوں کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ ماہ رمضان کا بڑی بے تابی اور شوق کے ساتھ انتظار فرماتے۔ نصف شعبان کے بعد نفل روزوں کا اہتمام نہیں کرتے۔ ہمارے اسلاف کا حال یہ تھا کہ وہ رمضان کو پانے اوراس کی سعادتوں سے مالا مال ہونے کے لئے چھ مہینہ قبل دعا میں مصروف ہوجاتے اور رمضان کی آمد کے ساتھ پوری جدوجہد کے ساتھ عبادات میں مشغول ہوجاتے یعنی روزہ تلاوت اذکار مسنونہ، شب بیداری، افطار کرانے ،صدقہ وخیرات، اعتکاف اور شب قدر کی تلاش وجستجو میں مگن رہتے اور جب یہ ماہ بخیر وخوبی گذر جاتا تو چھ ماہ تک مسلسل دعا کرتے کہ پروردگار عالم یارب العالمین یااله العالمین یا مجیب المضطرین ان سارے اعمال کو قبول فرمالے جو کچھ ہم سے میسر ہوا۔

رسول اللہ ﷺ اس ماہ مبارک کی عظمتوں کا تذکرہ فرماتے کہ اے لوگو!جب رمضان کا مہینہ شروع ہوتا ہے تو جنت کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں اور دوزخ کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں نیز سرکش شیاطین قید کردئے جاتے ہیں ایک اعلان کرنے والا اعلان کرتا کہ اے خیر کی طرف آگے بڑھنے والے! آگے بڑھ اور شر کی طرف جانے والے! باز آجا۔اور دوزخ سے آزاد کئے جانے والے ایک بڑی تعداد میں ہوں گے اور یہ سلسلہ روزانہ کا ہوگا۔(ترمذی ۶۸۲ صححه الالبانی)۔

ذیل میں ان امور کا تذکرہ ہے جن سے رمضان کریم کا استقبال ممکن ہے۔

۱۔اخلاص نیت:

ہرعمل کی قبولیت کا دارومدار اخلاص نیت پر ہی موقوف ہے۔ ایمان کامل کے بعد اخلاص وللّٰہیت پر توجہ دینا بہت ضروری ہے جیسا کہ ارشاد ربانی ہے ترجمہ: تو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے چاہیئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔(۱۱۰۔سورۃ الکہف) ارشاد نبوی ﷺ ہے انما الأعمال بالنیات وانما لکل امرىء مانوى ۔(بخاری) ترجمہ: اعمال کی قبولیت کا دارومدار اخلاص نیت پر ہی موقوف ہے۔اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ بندہ کو لمبی عمر ملے اور اس کا عمل اچھا ہو جیسا کہ ارشاد نبوی ﷺ ہے

خیرکم من طال عمره وحسن عمله یعنی تم میں اچھا انسان وہ ہے جس کی عمر طویل ہو اور عمل اچھا ہو (ترمذی ۲۳۲۹ صحیح)۔

۲۔دوام نعمت پر اللہ کا شکر بجالانا:

رمضان کریم بھی ایک نعمت ہے اس پر شکر بجالانا فرض عین ہے ۔مومن ہمیشہ دنیوی زندگی کی بقاء خیر میں زیادتی کے لئے ہی چاہتا ہے نہ کہ دنیا طلبی کے لئے۔ حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا : ''بے شک اللہ تعالیٰ بندہ سے اس بات پر خوش ہوتا ہے کہ بندہ لقمہ کھائے، پھر اس کی اس نعمت پر شکر بجالائے اور پانی پیتے ہوئے اس پر اس کی تعریف بیان کرے۔(مسلم)۔

حضرت سلمان فارسیؓ سے منقول ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام جب لباس پہنتے یا کھانا کھاتے یا کوئی مشروب پیتے تو فوراً الحمدللہ کہتے۔ اسی وجہ سے ان کا لقب عبد شکور رکھا گیا، یعنی شکر گذار بندہ (الدرالمنثور ۵/۲۳۶-۲۳۷)۔

نعمتوں کے ساتھ بے برکتی بھی ایک طرح کا عذاب ہے یا سزا ہے، جیسا کہ ہم روز مرہ کی زندگی میں اس کا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ بے برکتی کی مقدار بھی ناشکری کے مراتب کے ساتھ ساتھ موقوف ہے۔ اس لئے کہ قاعدہ یہ ہے الجزاء من جنس العمل – کَمَا تَدِینُ تُدان عربی محاورہ ہے۔جیسی کرنی ویسی بھرنی، اس لئے ہمیشہ یہ دعا زبان پر ہونی چاہئے۔ ترجمہ: اے پروردگار! تو مجھے توفیق دے کہ میں تیری ان نعمتوں کا شکر بجالاؤں جو تو نے مجھ پر انعام کی ہیں اور میرے ماں باپ پر اور میں ایسے نیک اعمال کرتا رہوں جن سے تو خوش رہے مجھے اپنی رحمت سے نیک بندوں میں شامل کرلے۔ ﴿النمل-۱۹﴾ ناشکری پر نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔

۳۔خالص توبہ کے ذریعہ:

ارشاد ربانی ہے ترجمہ: مومنو! اللہ کے آگے صاف دل سے توبہ کرو امید ہے کہ وہ تمہارے گناہ تم سے دُور کردے گا اور تم کو باغہائے بہشت میں جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں داخل کرے گا (سورۃ تحریم ۸)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں بہترین آدمی وہ ہے جس کی عمر طویل ہو اور عمل اچھا ہو (ترمذی ۲۳۲۹ صححہ الالبانی)۔توبہ سے اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے توبہ کرنے والے گناہ سے ایسے پاک وصاف ہوجاتے ہیں جیسے ان کا کوئی گناہ ہی نہ ہوا ہو۔

علماء کرام نے توبہ کے ۴ شروط بیان کئے ہیں ۱۔گناہ سے بالکلیہ اجتناب کرنا ۲۔عزم وحوصلہ ہو کہ دوبارہ اس گناہ کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔۳۔گناہ پر شرمندگی کا احساس ہونا۔۴۔لوگوں کے حقوق کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔

۴۔رمضان المبارک کی فضیلت اور عظمت کا احساس:

(۱) قرآن کریم رمضان مبارک کی مقدس رات میں اتارا گیا ہے (البقرۃ: ۱۸۵) اور (۲) روزہ کا ثواب بے حساب ہے (مسلم) (۳) جس نے ماہ رمضان کا روزہ ایمان کی حالت میں ثواب سمجھ کر رکھا اس کے پچھلے گناہ معاف کردئے جاتے ہیں (بخاری) (۴) رمضان میں عمرہ کا ثواب حج کے برابر ہے (مسلم)۔

۵. روزہ کی فضیلت وفرضیت کا اقرار:

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا :''روزوں کے لیے جنت میں ایک خصوصی دروازہ بنایا گیا ہے جس کا نام ''ریان'' ہے اس دروازہ سے صرف روزے دار ہی داخل ہوں گے'' (مسلم) اور یہ بھی ارشاد فرمایا: روزہ قیامت کے دن روزے دار کے لیے سفارش کرے گا۔(احمد)۔

روزہ ہر مسلمان، عاقل، بالغ، مرد، عورت، مقیم اور قدرت رکھنے والے پر فرض ہے اور وہ بچے جو نابالغ ہیں انہیں بھی عادت ڈالنے کے لیے روزے رکھوانا چاہیئے۔ اور ماہ رمضان کے روزے ۲ھ میں فرض ہوئے (زادالمعاد ۱/۱۶۰)۔

۶۔وہ لوگ جنہیں روزوں سے رخصت دی گئی ہے اور ان پر قضاء ضروری ہے :

(۱) مسافر (۲) ایسا بیمار جسے شفایابی کی اُمید ہو (البقرۃ: ۱۸۵) (۳) حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت اگر مشقت محسوس کرے (ترمذی) (۴) حائضہ اور نفاس والی عورت (بخاری، مسلم)

وہ لوگ جنھیں روزوں سے رخصت دی گئی ہے مگر ان پر قضاء ضروری نہیں ہے البتہ فدیہ ضروری ہے :

ا۔ وہ شخص جسے روزہ رکھنے کی قوت نہ ہو، جیسے بوڑھا مرد یا بوڑھی عورت (۲) اور ایسا بیمار جسے شفایابی کی اُمید نہ ہو ان کا فدیہ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے (بخاری) بقدر نصف صاع یعنی پونے دو کلوگرام گیہوں وغیرہ۔

۷۔عبادات کا شوق نہایت ضروری ہے:

یہ ماہ محترم عبادات کا موسم ہے اطاعت وفرمانبرداری کا مہینہ ہے، فرائض وسنن کی پابندی کا مہینہ ہے، خیرات وبرکات کا مہینہ ہے صبر کا مہینہ ہے، روزے کے فوائد لوٹنے کا مہینہ ہے۔ روزے کے فوائد درج ذیل ہیں (۱) روزہ تقرب الٰہی کا اہم ذریعہ ہے۔ (۲) تقویٰ حاصل کرنے کا ایک زرین موقع ہے۔ (۳) خوشحالی اور تنگدستی میں امتیازی فرق محسوس کرنے کا ذریعہ ہے اور خوشحال شخص اس کے ذریعہ بھوک اور پیاس کا اندازہ کرسکتا ہے (۴) نفس انسانی پر کنٹرول کرنے اور اسے نیک بخت بنانے کا ایک اہم ذریعہ ہے، بلکہ یہی تزکیہ نفس کا اہم حصہ ہے (۵) انسانی معدہ کو راحت پہنچانے اور اسے مُضر اثرات سے روکنے کا ذریعہ ہے، روزہ جسم کی زکاۃ اور اس کی پاکی وصفائی کا بہترین مظہر ہے۔ (۶) روزہ سے اسلامی سوسائٹی میں مساوات کا سبق ملتا ہے، اس معاملے میں شاہ وگدا امیر وغریب حکم میں برابر ہیں (۷) اطباء کا اتفاق ہے روزہ ہیشگی ودائمی مرض سے بچاتا ہے بالخصوص سل (T.B)، سرطان (Cancer)، جلدی امراض، اور معدے کی تمام بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے (۸) روزہ دار اللہ کی نعمتوں سے صحیح طور پر واقف ہوتا ہے۔ (رمضان کا نایاب تحفہ: ص ۲۶)۔

۸۔تلاوت کلام پاک کے ذریعہ استقبال:

تلاوتِ قرآن کی فضیلت : نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''قرآن پڑھا کرو کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والے کا مُونس وسفارش کرنے والا بن کر آئے گا'' (مسلم) ایک اور موقع پر ارشاد ہوا '' تم میں کا بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے '' (بخاری)۔

رمضان میں نبی کریم ﷺ کی تلاوت کا کیا حال تھا؟

صحیحین میں ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ '' نبی کریم ﷺ رمضان میں ہر رات جبرئیل امین کو قرآن سناتے اور اُن سے بھی قرآن سنتے تھے اور جس سال آپ ﷺ کا انتقال ہوا اُس سال آپ ﷺ نے دو مرتبہ قرآن کریم سُنایا'' (بخاری)۔

۹۔تلاوتِ قرآن کریم میں سلفِ صالحین کا کیا طریقہ رہا ہے؟

حضرت عثمان غنیؓ روزانہ ایک قرآن ختم کرتے تھے، بعض حضرات قیام رمضان میں ہر تین رات میں ایک قرآن ختم کرتے تھے اور کوئی سات راتوں میں ..... امام شافعیؒ رمضان میں 60 (ساٹھ) مرتبہ قرآن ختم کرتے تھے۔ حضرت قتادہؒ سات دن میں ایک قرآن ختم کرتے تھے، اور امام زہریؒ درس حدیث ترک کردیتے اور قرآن کی تلاوت میں پُوری طرح مشغول ہوجاتے تھے۔

۱۰۔قرآن کے تعلق سے ہم پر کیا حقوق وواجبات ہیں؟

قرآن کریم کے تعلق سے ہم پر پانچ حقوق وواجبات ہیں۔ (۱) اُس پر ایمان لانا کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ہے جسے اللہ نے شبِ قدر میں نازل فرمایا (۲) اُس کی تلاوت کرنا (۳) اس کے احکامات پر عمل کرنا (۴) تلاوت کے ساتھ غور وفکر کرنا اور عمل کا مشتاق بننا (۵) اس کی تعلیمات کو دوسروں تک پہنچانا۔

۱۱۔نماز تراویح کی فضیلت :

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس نے اللہ پر ایمان رکھتے ہوئے خالص اس کی رضامندی کے لیے رمضان کی راتوں میں قیام کیا اس کے سابقہ تمام گناہ بخش دئے جاتے ہیں (بخاری، مسلم) اور آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے امام کے ساتھ نماز (نماز تراویح) پڑھی یہاں تک کہ وہ نماز سے فارغ ہوا تو اُس کے لیے پوری رات کا قیام لکھا جائے گا (ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ)۔

۱۲۔کیا استقبالِ رمضان میں ایک دن یا دو دن پہلے

روزہ رکھنا جائز ہے؟

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''تم میں سے کوئی بھی رمضان سے پہلے ایک یا دو روزے نہ رکھے مگر جو شخص پہلے سے روزہ رکھتا آرہا ہو تو اُسے چاہیئے کہ اس دن کا روزہ رکھ لے (بخاری، مسلم)

۱۳۔ کیا مشکوک دن میں روزہ رکھنا جائز ہے؟

حضرت عمار بن یاسرؓ سے مروی ہے کہ ''جس شخص نے مشکوک دن میں روزہ رکھا اس نے ابوالقاسمؐ کی نافرمانی کی'' (رواہ البخاری تعلیقات) یعنی ۲۹ شعبان کو چاند نظر نہ آنے کی صورت میں محض شک کی وجہ سے روزہ رکھنا منع ہے۔ علم فلکیات کی آراء بھی قابل اعتماد و یقین نہیں ہوسکتیں۔ (بلوغ المرام ۱/۴۳۱)

صحیح احادیث کی روشنی میں یہ بات مسلم ہے کہ جب کوئی قابل اعتماد (دین دار) ایک یا دو مسلمان ۲۹/ شعبان یا ۳۰/شعبان کو سورج کے غروب ہونے کے بعد رمضان کا چاند دیکھ لیں تو ان کی رؤیت پر اعتماد کیا جائے گا۔ اس طرح ان کی رؤیت قابلِ قبول ہوگی اور چاند کا سورج غروب ہونے کے بعد ۲۰ منٹ یا اس سے کم یا زیادہ دیر تک رکنا کوئی ضروری نہیں ہے اس لیے کہ ہمیں صرف یہ حکم دیا گیا ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر روزے شروع کرو۔ اور اگر مطلع ابر آلود ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔ (بخاری، مسلم) رؤیت ہلال میں جدید حسابات پر اعتماد کرنا صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے اس پر اہل علم کا اجماع ثابت کیا ہے۔ (فتاوی الصیام: ص۱۳) اور مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری نے لکھا ہے کہ ایک جگہ اگر چاند نظر آئے تو سارے شہروں قصبوں اور دیہاتوں میں روزہ رکھا جائے گا بشرطیکہ ان جگہوں کا مطلع ایک ہی ہو۔ (بلوغ المرام ۱/۴۳۲)

۱۴۔ رؤیت ہلال میں کتنے آدمیوں کی رؤیت قابل قبول ہوگی؟

رمضان کے چاند کے لیے ایک عادل معتبر و مقبول آدمی کی شہادت قابل قبول ہوگی جمہور علماء کا یہی مذہب ہے مگر ہلال عید کے لیے دو آدمی کی شہادت کا ہونا ضروری ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں۔ (بلوغ المرام ۱/۴۳۲) بہر حال روزہ رکھنے اور چھوڑنے میں چاند کی رؤیت ضروری ہے محض فلکی حساب (Telescope) کافی نہیں ہے۔ (ریاض الصالحین ۲/۱۳۷)

۱۵۔ کیا رؤیت ہلال میں اہل مکہ کی رویت ساری دنیا کی رؤیت ہے؟

رؤیت ہلال میں محدثین کرام کے پاس ایک اُصول یہ ہے کہ "لکل بلد رؤیتھم" (صحیح مسلم) ہر شہر والوں کے لیے ان کی اپنی رؤیت معتبر ہے اہل مکہ کی رؤیت ہمارے لیے غیر معتبر ہے اختلاف مطالع کی وجہ سے اور وقت میں فرق ہونے کی وجہ سے بھی۔ لہذا راجح مسلک اور موقف یہی ہے کہ اختلاف مطالع سے احکام بدل جاتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالی کا ارشاد ہے "فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ" (البقرۃ:۱۸۵) ترجمہ: ''تم میں سے جو شخص اس مہینہ کو پائے اُسے روزہ رکھنا چاہیئے'' اور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ "اذا رأیتموہ فصوموا واذا رأیتموہ فأفطروا" ترجمہ: جب تم اس کو (چاند) دیکھو تو روزہ رکھو اور جب تم اس کو دیکھ لو تو روزہ چھوڑ دو۔ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت کریبؓ کی شہادت کو قبول نہیں کیا، جب کہ انہوں نے شام میں چاند دیکھا تھا۔ (مسلم ۳/۱۹۷) آیت اور حدیث سے استدلال ہے کہ حکم شرعی گواہی اور رؤیت پر موقوف ہے۔ لہذا اہل مکہ کی رؤیت ساری دنیا کے لیے نہ ممکن ہے۔ یہی جمہور اہل علم (سلف وخلف) کا موقف ہے۔ واللہ أعلم بالصواب وھو الھادی الی سواء السبیل.

۱۶۔ چاند دیکھنے کے وقت کونسی دُعا پڑھنی چاہیئے؟

طلحہ بن عبیداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ چاند دیکھتے تو یہ دُعا پڑھتے تھے۔ اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَالسَّلَامَۃِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ ھِلَالُ رُشْدٍ وَخَیْرٍ۔ (ترمذی، حسن)

ترجمہ: اے اللہ! اس چاند کو ہم پر امن وایمان اور سلامتی اور اسلام کے ساتھ نکال۔ اے چاند! میرا اور تیرا رب اللہ ہے، اے اللہ! یہ چاند ہدایت اور بھلائی کا چاند ہو۔

☆☆☆

❑ قند مکرر

رمضان ''ماہ قرآن'' کے طور پر گزاریے

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

رمضان تربیت، مجاہدۂ نفس، رحمتوں کے نزول، برکتوں کی بارش اور نیکیاں کمانے کا موسم بہار ہے، دن بھر پیٹ کے روزے کے ساتھ، دل، دماغ، ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان اور سب سے بڑھ کر زبان کے روزے کا جو حکم دیا گیا، اس کے نتیجہ میں اگر ایک طرف بقیہ گیارہ مہینوں کے لیے اس میں تربیت کا نظم ہے تو دوسری طرف یہ مہینہ نیکیوں سے اپنا خزانہ بھر لینے کا ہے۔ جب مالک کون ومکاں نے اپنی رحمتوں کا خزانہ کھول دیا تو آپ بھی بھر بھر کے لینے سے نہ چوکیے، فرائض وواجبات کی پابندی کیجئے، نوافل کا اہتمام کیجئے، تلاوت کیجئے، ہر وقت اللہ اللہ، سبحان اللہ، الحمدللہ کی مالا جپیے، زکوۃ کو بوجھ نہ سمجھیے بلکہ خدا کی رحمت سمجھیے، کل مال کا حساب کیجئے، مستحقین تک اسے پہنچائیے اور اس طرح پہنچائیے کہ دل رب کے شکر کے جذبات سے امڈ آئے، خدایا تیرا شکر ہے کہ تو نے اس لائق بنایا کہ آج ہمارے مال میں تیرے دوسرے بندوں کا حق بھی نکل رہا ہے، وفی أموالهم حق معلوم للسائل والمحروم (معارج:۲۴-۲۵)(ترجمہ:اور جن کے مال میں ایک طے شدہ حق سائل ونادار کا ہے)۔ صدقات کا اہتمام کیجئے، اللہ کے بندوں کو خوش کیجئے، ضرورت کے ماروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی ضرورتیں پوری کیجئے اور اپنے رحیم آقا سے مغفرت کا پروانہ حاصل کیجئے، یہ سب اگر آپ اخلاص کے ساتھ کرلے گئے تو یقین مانیے کہ دل کی دنیا بدل جائیگی، اور اصل سودا تو یہی ہے کہ دل بدل جائے، رمضان کے روزوں، تراویح واعتکاف یا دیگر عبادات کے کتنے اثرات آپ پر مرتب ہورہے ہیں، آپ کی وجہ سے معاشرہ پر کیا اثر پڑ رہا ہے اسی سے اپنی عبادتوں میں اپنے اخلاص اور قبولیت کا اندازہ کرلینا چاہیے۔

یہاں ایک بات خاص طور پر عرض کرنا ہے، حضور ﷺ معصوم تھے، گناہوں سے مبرا تھے، لیکن عبادات کا بہت اہتمام کرتے تھے، نمازیں ایسی طویل پڑھتے کہ پاؤں پر ورم آجاتا، اماں عائشہ صدیقہؓ عرض کرتیں: آپ کیوں اس قدر مشقتیں برداشت کرتے ہیں؟ آپ تو بخشے بخشائے ہیں، فرماتے کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ رمضان کا آپ بہت اہتمام فرماتے، شعبان میں ہی رمضان کے استقبال کی تیاری شروع کردیتے۔ ذرا نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاری اور اہتمام اور جذبۂ عبودیت پر غور کیجئے اور یہ طے کرلیجئے کہ اس بار رمضان کو تربیت ومجاہدۂ نفس کے لیے گزارنا ہے، عبادتوں کا خوب اہتمام کرنا ہے اور رمضان کو ''ماہ قرآن'' کے طور پر اس طرح گزارنا ہے کہ دنیا کو معلوم ہوجائے کہ قرآن سب کے لیے ہے اور رمضان سے اس کا بڑا گہرا رشتہ ہے۔ شهر رمضان الذى انزل فيه القرآن هدى للناس وبينات من الهدى والفرقان (بقرہ:۱۸۵)(ترجمہ: رمضان کا مہینہ ہی ہے جس میں قرآن پاک اتارا گیا، جو تمام انسانوں کے لئے ہدایت نامہ ہے، اور ہدایت اور حق وباطل اور صحیح وغلط میں تفریق کے واضح دلائل پر مشتمل ہے)۔ یاد رکھیے اگر اس حقیقت کو سمجھ کر آپ نے قرآن کو پڑھا اور لوگوں کے سامنے پیش کردیا تو آپ کو بھی عزت وعظمت کی سند ملے گی اور فی الحقیقت عالمی حیثیت عطا کردی جائے گی، اسی قرآن کو دے کر تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عالمی حیثیت دی گئی، تبارك الذى نزل الفرقان على عبده ليكون للعالمين نذيرا (فرقان:۱)(ترجمہ: بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندہ پر ''فرقان''-حق وباطل میں تمیز کرنے والی کتاب-اتاری)۔

لوگوں کے سامنے اس کی وضاحت کیجئے کہ قرآن کو رمضان میں ہی لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا گیا، اور اسے جس رات میں اتارا گیا اسے ليلة القدر کہا گیا، اس رات کی فضیلت میں پوری سورہ نازل کی گئی انا انزلناه فى ليلة القدر (قدر:۱)(ترجمہ: ہم نے (قرآن عظیم) کو شب قدر میں اتارا ہے)۔ ''ہم نے اس کو سال بہ سال کے تقدیری فیصلوں کی رات میں اتارا ہے''، اور یہ رات رمضان میں ہے، روایات کے مجموعہ پر غور کیجئے تو غالب گمان یہ ہے کہ آخری عشرہ میں ہے اور اس میں بھی ۲۷ ویں شب میں ہونے کا زیادہ امکان ہے، اسی سے پتہ چلتا ہے کہ رمضان اور قرآن کا رشتہ بہت مضبوط ومستحکم ہے۔

لوگوں کو بتائیے کہ رمضان محنت، جدوجہد، مجاہدۂ نفس اور جہاد کا مہینہ ہے، اسی مہینہ میں حضورؐ نے گوشۂ عافیت سے نکل کر تپتے صحرا میں بدر کے مقام پر کفار سے دودو ہاتھ کیے تھے، آپ عہد مکی کے ماحول میں ہیں تو عہد مکی کے حکم وجاهدهم به جهادا كبيرا

(فرقان:۵۲) (ترجمہ: اور اس قرآن کے ذریعہ ان سے زبردست جہاد کریں) کا منظر پیش کیجئے، قرآن کو لے کر جہاد کیجئے، اس کے ذریعہ جدوجہد کیجئے، اس کو پڑھیے پڑھائیے اور اس قدر پڑھیے کہ یتلو علیھم (بقرہ:۱۲۹) (ترجمہ: جوان کو تیری کتاب کی آیتیں پڑھائے) کا سماں بندھ جائے، اس کو سمجھیے اور سمجھائیے اور اتنی کوشش کیجئے کہ ویزکیھم (بقرہ:۱۲۹) (ترجمہ: اور ان کا تزکیہ فرمادے) کے مطالبے پر عمل ہوجائے، اس کی تعلیم کیجئے، اس کے حلقے لگائیے، اس کی محفلیں سجائیے اور اس کے نور سے دلوں کو منور، دماغوں کو روشن کرنے کی تحریک چلائیے اور اس حد تک گزر جائیے کہ ویعلھم الکتاب والحکمۃ (بقرہ:۱۲۹) (ترجمہ: اور جوان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے) کا منظر گھر گھر، گلی گلی، محلے محلے نظر آئے، اگر قرآن تذکیر کے لیے آیا ہے وذکر بالقرآن من یخاف وعید (ق:۴۵) (ترجمہ: اور آپ قرآن سے ان لوگوں کو نصیحت کیجیے جو اللہ سے ڈرتے ہیں) تو اس رمضان میں تذکیر بالقرآن اور تبلیغ قرآن کا حق ادا کرنے میں لگ جائیے۔ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل إلیك من ربك وإن لم تفعل فما بلغت رسالته والله یعصمك من الناس إن الله لا یھدی القوم الکافرین (مائدہ:۶۷) (ترجمہ: اے پیغمبر! آپ کی طرف پروردگار کے پاس سے جو نازل کیا گیا ہے، اسے (لوگوں تک) پہونچا دیجئے، اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو پیغمبری کا حق ادا نہیں کیا، اللہ آپ کی لوگوں سے حفاظت فرمائے گا، اللہ کافروں اور منکروں کو توفیق ہدایت نہیں دیتا)۔

اگر رمضان کا قرآن سے رشتہ ہے، تو اس رشتہ کو نبھائیے، اگر رمضان تربیت کا لاثانی و بے مثال نظام ہے تو اس میں نازل کی گئی کتاب کے بے نظیر انقلابی پیغام کو سمجھیے اور لوگوں تک پہنچائیے، قرآن سے روح کو تازہ کیجئے، وہ نسخۂ شفا ہے تو اس سے دل کا علاج کیجئے، اس کی تلاوت وتعلیم وتبلیغ کو مہم بنالیجئے اور قرآن کی تحریک چھیڑ دیجئے۔ نام ونمود اور افطار کی سیاسی دعوتوں سے بچیے، قرآن کی مجلس اور قرآن کی دعوت کا اہتمام کیجئے، قرآن کا پیغام انسانیت، پیغام محبت ورحمت اور پیغام امن وسلامتی عام کیجئے، اس کے معاشرتی، عائلی اجتماعی انفرادی قوانین واعمال ہر ہر شخص تک پہنچائیے، اس کے بیان نعمت ورحمت سے لوگوں کو شوق دلائیے، وعید وعذاب کے تذکروں کو چھیڑیے اور خوف دلائیے، خوف ورجا کے قرآنی نسخے استعمال کیجئے، یاد رکھیے!!!

قرآن تازہ تھا، تازہ ہے، اور تازہ رہے گا، اسی کے ذریعہ اللہ قوموں کو عروج بخشتا ہے اور اسی کو چھوڑ دینے پر ذلیل وخوار اور نیست ونابود کر دیتا ہے، قرآن کا حرف حرف اور لفظ لفظ زندہ معجزہ ہے، اس کی نغمگی، اس کی تلاوت، اس کے معانی، اس کی شریعت، اس کے احکامات سب معجزہ ہیں، قرآن دنیائے انسانیت کا سب سے بڑا اور زندہ معجزہ ہے، انبیاء کو جو معجزات دیے گئے وہ ان ہی کے ساتھ رخصت ہو گئے، مگر ہمارے نبی کو بشکل قرآن جو معجزہ دیا گیا وہ ایک زندہ جاوید معجزہ ہے، **بس اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اسی طاقت وقوت اور یقین کے ساتھ اسکو پیش کیا جائے جیسے نبیؐ اور آپ کے شاگرد پیش کیا کرتے تھے**، جس کو سن کر لوگوں کے دل مسخر اور دماغ مسحور ہوجاتے تھے، وہ اپنے اوپر قابو نہیں رکھ پاتے تھے، جس قدر وہ سنتے جاتے تھے آہیں بھرتے جاتے تھے اور ایسی آہیں کہ دریا خشک کر جائیں، آج بھی دنیا قرآن کی اس معجزاتی کیفیت سے واقف ہے، **آپ طے کر لیجئے کہ اس رمضان میں ہماری سحر، افطار، دن رات سب کی ابتدا تلاوت قرآن سے اور اختتام تلاوت قرآن پر، بغیر کسی لاؤڈ اسپیکر کے ہر دکان، ہر بازار، ہر مسجد اور ہر گھر میں تلاوت وتذکیر بالقرآن کا اس قدر اہتمام کیجیے کہ کوئی سماعت سننے سے محروم نہ رہ جائے، ختم قرآن کی تقریب میں کوئی خرافات نہ کیجیے، مگر تڑپ وخلوص اور دلسوزی کے ساتھ تلاوت کرنے والوں سے درخواست کیجئے اور انھیں بلائیے، حکمت ومصلحت کے ساتھ برادران وطن کو ضرور قرآن کی مجلسوں بالخصوص ختم قرآن کی تقریب میں شریک کیجیے، اور اگر وہ شریک ہوں تو پرسوز تلاوت کے بعد نپے تلے قرآنی و نبوی انداز میں توحید ورسالت وآخرت اور اسلام کے پیام اخوت ومساوات اور امن وسلامتی پر گفتگو کیجیے۔**

آج دنیا بہت سے دن Days ہفتے Weeks اور مہینے Months مناتی Celebrat ہے، ذرا اس بار آپ رمضان وقرآن کے اس حقیقی تعلق کو نبھائیے اور اس رمضان کو "ماہ قرآن" کے طور پر منانے کا عزم کیجئے، بھر دیجئے فضاؤں کو اپنی تلاوت سے، پورے کر دیجئے تذکیر بالقرآن کے تقاضے اور پہنچا دیجئے سب تک قرآن کی دعوت، کم از کم اپنے آس پاس کے انسانوں پر قرآن کی حجت قائم کر دیجیے، امید ہے کہ ہماری قسمت بدل جائے اور دکھی دنیا کا مقدر سنور جائے، اور اس قرآنی مہم کے ذریعہ ملت کی کشتی پار لگ جائے، رہا اپنا بدلہ، اپنا صلہ تو وہ کہیں جائے گا ہی نہیں، کیوں کہ وہ رب کریم کے پاس محفوظ رہے گا۔ ☆☆☆

❑ مطالعۂ شخصیات

فکر بوالحسن- کچھ گوشے

تقریر: مولانا سید سلمان حسینی ندوی

پیشکش: حسن عمار

نوٹ: جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں رابطہ ادب اسلامی کے اجلاس میں مولانا سید سلمان حسینی ندوی نے یہ خطاب کیا، خطاب کے مغز اور متعدد اہم پہلوؤں پر گفتگو کے پیش نظر عزیزم حسن عمار متعلم علیا اولیٰ دار العلوم ندوۃ العلماء نے رکارڈنگ سے نقل کیا اور پھر مولوی سہیل ندوی نے مراجعت کی، افادۂ عام کی غرض سے اس کو شائع کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

حمد وصلوۃ کے بعد!

حضورﷺ کا ارشاد ہے "اذکروا محاسن موتاکم" قرآن پاک کی سورۃ فاتحہ میں ہر مؤمن کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس بات کی دعا مانگے کہ اے اللہ! ہم کو صراط مستقیم پر چلا دے، ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا اور پھر اس کی تشریح کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ومن یطع اللہ والرسول فاولئك مع الذين أنعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا، (سورۃ النساء:٦٩)۔

محترم بزرگو! میرے دوستو بھائیو! جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمۃ اللہ علیہ پر جو سیمینار منعقد ہو رہا ہے، اس سے پہلے جامعہ سید احمد شہید میں مولانا کی وفات کے بعد ایک عالمی سیمینار منعقد ہوا تھا، اور پھر چند سال پہلے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے کینیڈی ہال میں ڈاکٹر طارق ایوبی ندوی کی طرف سے بھی ایک عالمی سیمینار منعقد کیا گیا تھا جس میں ۱۴-۱۵ ملکوں سے نمائندگان شریک تھے، جو حضرات گزر جاتے ہیں؟؟ وہ انبیاء ہوں، صدیقین ہوں، شہداء ہوں، صالحین ہوں اور اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ حضرت مولانا صالحین کی فہرست میں شامل تھے، ان کے بارے میں قرآن پاک یہ کہتا ہے: لقد كان في قصصهم عبرة لأولي الألباب ما كان حديثا يفترى ولكن تصديق الذين بين يديه وتفصيل كل شيء وهدى ورحمة لقوم يؤمنون (سورہ یوسف:۱۱۱) مومنین اور صالحین کے واقعات قرآن پاک میں اس لیے بیان کیے گئے ہیں کہ ان کے نمونے سامنے رکھے جائیں اور ان پر عمل کیا جائے، حضور اکرمﷺ کے بارے میں فرمایا گیا "لقد كان لكم في رسول الله أسوة حسنة لمن كان يرجو الله واليوم الآخر وذكر الله كثيراً" (سورۃ الأحزاب:۲۱) آپ کی اس امت پر واجب ہے کہ اسوہ حسنہ کو اپنے سامنے ہر حال میں رکھے، آپ کی طرف رجوع کرے، اور اس پر یقین رکھے کہ "وما ارسلنا من رسول إلا ليطاع بإذن الله" پھر اس پر بھی یقین رکھے کہ "كل يوخذ من قوله ويرد عليه إلا رسول الله والانبياء والمرسلين في ازمنتهم وعصرهم"۔

نبی آخری حجت ہوتا ہے، نبی کے بعد، ختم المرسلین کے بعد جن کو ایک قانونی حیثیت عطا کی گئی ہے، ان میں سرفہرست ابوبکر

وعمر ہیں،حضورؐ نے فرمایا: عن حذيفة رضى الله عنه، قال: قال رسول الله ﷺ: إني لا أدرى ما بقائى بينكم؟ اقتدوا بالذين من بعدى: أبى بكر و عمر (حدیث نمبر ۳۶۲۵، ترمذی باب فی مناقب ابی بکر وعمر) پھر چاروں خلفائے راشدین ہیں" عليكم بسنتى وسنة الخلفاء الراشدين عضوا عليها بالنواجذ، فإن كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة، وكل ضلالة فى النار، پھرعمومی طور پر صحابہ کرام ہیں،والسابقون الاولون من الهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه، وأعدلهم جنت تجرى تحتها الأنهار خالدين فيها ابدا، اس فہرست میں جو بھی شامل ہیں،اس میں صحابہ بھی ہیں،تابعین بھی ہیں، تبع تابعین بھی ہیں اور قیامت تک آنے والے صدیقین،شہداء اور صالحین ہیں جن کا تذکرہ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے،ہمیں شرعی نقطہ نگاہ سے ہی شخصیتوں کا جائزہ لینا ہے،حضرت مولاناؒ نے حضور اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ پر بچوں کے لیے بھی کتابیں لکھیں،عوام کے لیے بھی کتاب لکھی، پڑھے لکھوں اور خواص کے لیے بھی کتاب لکھی اور تاریخ دعوت وعزیمت میں خلفائے راشدین کا بھی تذکرہ کیا اور تابعین کا بھی کیا اور ائمہ فقہاء اور مجتہدین کا بھی کیا اور اجلۂ محدثین کا بھی کیا اور متکلمین کا بھی کیا، ابومنصور ماتریدی کا بھی اور ابوالحسن اشعری کا بھی، اور صدیقین کا بھی اور ائمہ اربعہ کا بھی اور خاص طور پر امام احمد بن حنبل کا عباسی مملکت کے مقابلہ پر ایک مسئلہ کی خاطر کھڑا ہوجانا،جیل جانا،کوڑے برداشت کرنا اس کا بڑی قوت کے ساتھ اور زبان وبیان کی طاقت کے ساتھ تذکرہ فرمایا کہ اسپین سے لے کر ہندوستان تک جو حکومت تھی اور وقت کی سپر پاور تھی مسئلہ خلق قرآن پر جو ایک جزوی مسئلہ ہے، اور بنیادی عقائد میں داخل بھی نہیں ہے،لیکن احمد بن حنبل نے وقت کی سپر پاور سے جو کہ مسلم تھی اور شریعت پر پابند تھی ٹکر لی اور اسے گوارا کیا کہ انہیں جیل میں ڈالا جائے،سزائیں دی جائیں،لیکن اسے گوارا نہیں کیا کہ خاموشی اختیار کریں اور اتنی بھی تحریف و انحراف ہونے دیں۔امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں سب جانتے ہیں جو ان کی سیرت پڑھ چکے ہیں کہ بنوامیہ کے دور میں کوفہ کے گورنر نے ان کو کوڑے لگوائے اور پھر وہ دور آیا کہ ان سے عباسی دور میں جب پھریرے اسپین سے لے کر چائنا تک لہرا رہے تھے،ان کی آزمائش کے لیے عہدہ قضا قبول کرنے کا مطالبہ کیا، کیوں کہ حکومت کو یہ معلوم تھا یہ باغی طاقتوں کے ساتھ ہیں، حکومت کو معلوم تھا کہ زید کے ساتھ ہیں،حضرات حسینؓ کے صاحب زادہ کے ساتھ ہیں،اور پھر ان کے صاحب زادے کے صاحب زادہ ذوالنفس ذکیہ کے ساتھ ہیں،ادھر مدینہ منورہ کا فقہ کا امام مسجد نبوی میں درس دے رہا تھا،اور وہ ذوالنفس الذکیۃ کے ساتھ تھا، وہ زید کے ساتھ تھا، فقہ کے اشاروں میں وہ صورت حال کو بیان کرتا تھا اور ادھر ابوحنیفہ مالی امداد بھی کرتے تھے،اور ان طاقتوں کے ساتھ تھے جو اہل بیت سے تعلق رکھتی تھیں جن پر خلافت راشدہ کے بعد ظلم کیا گیا اور حضرت حسین کو کربلا میں شہید کیا گیا اور اس کے بعد ان کے خاندان کے افراد کا تعاقب کیا گیا، قبریں کھودی گئیں، لاشیں نکالی گئیں، سولی پر لٹکائی گئیں، یہ مسلمانوں کی تاریخ کا وہ سیاہ وناپاک دور ہے،جس نے خلافت راشدہ سے گویا انتقام لیا،امام ابوحنیفہ ان طاقتوں کے ساتھ تھے اور اسی بنیاد پر منصور عباسی نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ جیف جسٹس کا عہدہ قبول کرلیں،ایک آزمائشی مطالبہ تھا اور اسے معلوم تھا کہ یہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں گے، کیوں کہ حکومت کے کسی عہدہ کو قبول کرنے کے لیے یہ تیار نہیں ہیں، اور اس سے ان کا موقف سامنے آجائے گا کہ یہ باغیوں کے ساتھ ہیں،لہذا عہدہ کی پیشکش کی گئی اور ادھر سے تردید کی گئی اور اس کو قبول نہیں کیا گیا،تو انہیں بغداد کی جیل میں ڈالا گیا، اور پھر وہیں ۱۵۰ھ میں وفات ہوئی، کہا جاتا ہے کہ زہر دے کر ان کو مارا گیا،اور زہر دے

کر نہ بھی مارا گیا ہوتو کیا کیا تکالیف دی گئیں، جب بنوامیہ کا گورنر کوفہ ان کے کوڑے لگا سکتا ہے تو بنی عباس کے دور میں جس نے بنی امیہ اور اہل بیت کا تعاقب کیا اور چن چن کر مارا، امام مالک کے کاندھے سے ہاتھ اکھڑوا دیے گئے مدینہ میں اس وقت بنوامیہ کی طاقت کی نمائندگی کرنے والے جو حکام تھے انہوں نے امام مالک کو سزا دی، امام شافعی یمن میں تھے، اہل بیت کے ساتھ ان کے تعلق کا الزام لگایا گیا اور یمن سے گرفتار کر کے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں پہنا کر بغداد ہارون رشید کے دربار میں لایا گیا اور ان کے سامنے کئی کو قتل کیا گیا، اور ان کی باری تھی لیکن دربار میں احمد بن الحسن الشیبانی موجود تھے، جن کے پاس شافعی نے تعلیم حاصل کی تھی اور جو ان کے لیے سرپرستی میں مثل باپ کے تھے، انہوں نے ان کی سفارش کی، صفائی دی، اس بنیاد پر پھر امام شافعی کو چھوڑ دیا گیا، ابو حنیفہ ہوں یا مالک ہوں یا شافعی ہوں یا احمد بن حنبل ہوں، یہ ہے ہماری تاریخ، کروڑہا کروڑ انسان جوان کے مسلک کو مانتے ہیں اور ان سے عقیدت رکھتے ہیں ان کو یہ تو معلوم ہے وضوء اور غسل اور نماز وروزہ کے مسائل ان سے کیا منقول ہیں، مدرسوں میں یہ پڑھائے جارہے ہیں، لیکن ان کے سیاسی موقف کے بارے میں نہیں بتایا جارہا ہے، اور ان سے پہلے سعید بن المسیب کے ساتھ کیا ہوا، اور سعید بن الجبیر کے ساتھ کیا ہوا، اور کس کس کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ تاریخ جو ہے محفوظ ہے، اس تاریخ کو ضروری ہے کہ امت کے سامنے پیش کیا جائے۔

ابوالحسن علی ندوی کا جہاں تک تعلق ہے کہ جس گھر میں وہ پیدا ہوئے اس گھر میں چرچا تھا اور اس سے زیادہ چرچا سہارنپور میں تھا، مظفرنگر میں تھا، کاندھلہ میں تھا۔ آپ جس گھر میں پیدا ہوئے اس گھر کی نسبت شاہ علم اللہ کے بعد حضرت سید احمد شہید کی طرف تھی، اور سید احمد شہید پر پہلا مضمون ابوالحسن علی ندوی نے ۱۶ سال کی عمر میں لکھا تھا، جس کو مصر سے شائع کیا گیا، اور پھر اس کے بعد سب سے پہلی کتاب جو تیار کی اس کا نام سیرت سید احمد شہیدؒ ہے، عین جوانی میں اس کتاب کے آغاز کا یہ واقعہ ہے جو کاروان زندگی میں موجود ہے، اس کی تفصیلات ہیں کہ ٹونک میں اس کا وہ طاقتور اور جاندار اور انقلابی مقدمہ لکھا گیا، جس نے اس تحریک کی ایک طاقتور ترجمانی کی، لیکن جب یہ کتاب شائع ہوئی اور جانے پہچانے جن لوگوں کو بھیجی گئی تو ان میں ایک دوست منظور نعمانیؒ بھی تھے جو مولانا عبد الشکور صاحب کے مدرسہ دار المبلغین میں پڑھاتے تھے اور جن سے مولانا کا تعارف ان کے صاحب زادہ کے واسطے سے ہوا تھا، تو یہ کتاب ان کو بھی بھیجی گئی، انہوں نے مولانا کو خط لکھا کہ رات میں جب سونے کا وقت آ گیا تھا تو یہ کتاب مجھے ملی، پھر میں سو نہیں سکا، رات بھر پڑھتا رہا، اب میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ صرف ایک سوانحی کتاب ہے یا اس تحریک کو برپا کرنا چاہتے ہیں؟ کیا کسی تحریک کا ارادہ ہے؟ تو مولانا نے کاروان زندگی میں لکھا ہے کہ میں نے شرما حضوری میں کہا کہ ''ہاں! تحریک ہونی چاہیے''، مولانا منظور صاحب کی ان سے ملاقات ہوئی اور مولانا منظور صاحب نے اس وقت کے حالات میں یہ کہا کہ خاکسار تحریک نے اودھم مچا رکھا ہے اور علامہ مشرقی کی خاکسار تحریک کے مقابلے کے لیے ہم کو ایک عسکری تحریک تیار کرنی چاہیے، مولانا نے کہا کہ میں اپنے اندر اس کی اہلیت نہیں پاتا، لیکن اصولی طور پر مجھے اتفاق ہے کہ تحریک ہونی چاہیے، تو اب وہ کون ہو کہ جو اس نئی تحریک کی عمارت کا فریضہ انجام دے اور تحریک سید احمد شہید یا تحریک شہیدین کو پھر برپا کیا جائے، دونوں میں بات چیت ہوئی اور طے ہوا کہ اس کے لیے انتخاب اگر کیا جاسکتا ہے تو جناب عبدالواحد صاحب کا جو بلوچستان کے ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں، لیکن بڑے دیندار ہیں اور انگریزی پر اچھی قدرت رکھتے ہیں، اس بنیاد پر یہ طے ہوا کہ اب ہم لوگ سفر کریں اور ان سے ملاقات کریں، سفر کیا گیا، سفر میں رائے پور

سے بھی گزرا گیا، سہارن پور سے بھی گزرا گیا، تھانہ بھون سے بھی گزرا گیا، حضرت تھانوی اس وقت موجود نہیں تھے ان سے ملاقات نہیں ہوئی، بلوچستان پہونچ کر عبدالواحد صاحب سے ملاقات ہوئی اور جو مشورہ ہوا اس میں یہ طے ہوا کہ اس قت جو تحریک ان مقاصد کے لیے برپا ہے، وہ جماعت اسلامی کی ہے، اور مولانا مودودی نے یہ تحریک برپا کر رکھی ہے، مولانا منظور نعمانی اور مولانا ابوالحسن ندوی دونوں ترجمان القرآن کو پڑھتے تھے اور ان کے مضامین پر سر دھنتے تھے اور اس کا اعتراف کرتے تھے کہ شبلوی قلم اور سلیمانی علم اور معرفت اور تحقیق اور اس کے ساتھ ساتھ جدید ترین معلومات اور جدید تعلیم یافتہ طبقے کو مخاطب کرنے کی جو طاقت مولانا مودودی کو حاصل ہے، اور کسی کو نہیں ہے، چل کر ان سے ملنا چاہیے، تو یہ تینوں حضرات مولانا مودودی کے پاس گئے اور ان سے ملاقات ہوئی اور صرف ملاقات ہی نہیں ہوئی بلکہ آگے چل کر جماعت میں شمولیت اختیار کر لی گئی، مولانا منظور نعمانی نے بھی شمولیت اختیار کی، عبدالواحد صاحب نے بھی شمولیت اختیار کی، ابوالحسن ندوی نے بھی شمولیت اختیار کی اور مولانا کا کاروان زندگی میں یہ کہنا ہے کہ میرا ان سے تعلق ہوا، لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ مولانا کا جہاں تک تعلق ہے، مولانا کے بارے میں ان کے لوگوں میں بڑا غلو پیدا ہو گیا ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام کو صحیح طور پر مولانا نے ہی سمجھا ہے، اور اس دور میں وہی اس کے ترجمان ہیں، یہ غلو خطرناک ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جو متفق شخصیتیں تاریخ اسلام کی ہیں، ان میں صوفیاء ہوں یا علماء ہوں، ان پر وہ کڑی تنقید کرتے ہیں، تیسری بات یہ ہے کہ مولانا میں وہ روحانیت اور عبادت وزہد وارتقاء کی کیفیت محسوس نہیں ہوتی، مولانا جن کے دیکھنے کے منتظر تھے اور سیرت سید احمد شہید لکھتے وقت اور ''نزھۃ الخواطر'' پڑھتے وقت اور ان کے علاوہ دیگر کتابیں پڑھتے سنتے اور خاندان کے بزرگوں کے تذکرے سنتے وقت جس شخصیت کے وہ امیدوار تھے وہ وہاں نہیں ملی اور سنہ ۴۰ء کی بات ہے، اور سنہ ۴۰ء میں ہی مولانا حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے مشورہ سے دہلی چلے گئے اور دہلی میں حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی، ان کے ساتھ میوات حاضری ہوئی، میوات میں جو تحریک تبلیغ ودعوت کی چل رہی تھی اس کے مشاہدے ہوئے، تبلیغ کے مشاہدے تو اپنی جگہ پر مولانا اس سے بہت متاثر ہوئے اور سنہ ۴۰ میں لکھنو میں واپسی پر ندوۃ العلماء مرکز بنا کر مولانا نے تبلیغ و دعوت کا کام شروع کر دیا، لیکن اصلاً مولانا مودودی کے تقابل میں مولانا الیاس صاحب کے یہاں وہ دیکھا جس کو وہ دیکھنا چاہیے تھے، انہیں ایسا لگا کہ گویا صحابہ کرام کی جھلکی یہاں نظر آرہی ہے تابعین کی تجلیات کا یہ مرکز ہے، مولانا کے اندر ان کی عقیدت پیدا ہوئی، اتنا انفعال اتنا تأثر کہ مولانا کا یہ کہنا ہے کہ دلی میں ایک کام کے لیے عبدالواحد صاحب کے ساتھ میرا جانا ہوا اور انہیں دیر لگی مرکز واپس آنے میں تو میری بے چینی کا یہ عالم تھا کہ اگر دوسرا کوئی مجھے دیکھتا تو سمجھتا کہ یہ آدمی پاگل ہو گیا ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ کسی طرح میں دروازہ توڑ کر چلا جاؤں مولانا الیاس صاحب کی جاذبیت اور تاثیر اور مولانا کی انفعالیت وشدید تأثر کی یہ کیفیت تھی۔ خوب یاد رکھا جائے کہ یہ کیفیت تبلیغ ودعوت کے چھ نمبروں کی نہیں تھی، اسی لیے سنہ ۳۳ میں مولانا کا انتقال ہوا، مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی کو جب جماعت کا امیر بنایا گیا تو مولانا کا یہ کہنا ہے کہ میری جو پہلی ثقافت تھی وہ ندوۃ العلماء کی ثقافت تھی اور جو کچھ بھی میں نے پڑھا دیکھا، میں اس کے سایہ تلے اس نظام کو پوری طرح ہضم نہیں کر پایا تھا، اور میرا ذہن اپنا کام کر رہا تھا، اس لیے میں نے مولانا یوسف صاحبؒ سے کئی مرتبہ بات کی کہ کام کی توسیع ہونی چاہیے، کام کو کچھ کم کرنے اور چھانٹنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن کام کی توسیع ہونی

چاہیے، لیکن مولانا کا کہنا ہے کہ میں نے مولانا کے اندر اس سلسلے میں کسی تغیر کا پہلو نہیں دیکھا اور کسی تبدیلی کی طرف کوئی قدم اٹھاتے ہوئے احساس نہیں ہو سکا، مجھے لگا کہ مولانا اسی دائرہ میں ہیں اس سے باہر نہیں نکل سکتے، اور یہی وہ صورتحال تھی جو مولانا انعام الحسن کے دور میں اور زیادہ پختہ ہو کر سامنے آئی، یہ صورتحال سنہ ۴۵ کی ہے، سنہ ۴۷ میں مولانا تبلیغی دعوت کے دورے پر حج کے لیے تشریف لے گئے اور حجاز میں بہت سے ذمہ داروں سے ملاقاتیں ہوئیں، لیکن جب واپسی ہوئی تو ہندوستان تقسیم ہو چکا تھا، ہندوستان تقسیم ہوا تھا ۳ لاکھ لاشوں پر، ہندوستان کا منظر بدل گیا تھا، جو اس سے پہلے انگریزوں کے دور میں فرقہ واریت کا جن تھا، اب وہ بالکل بوتل سے باہر آ گیا تھا اور ایسا عفریت اور ایک ایسا بھوت تھا جو پورے ملک پر مسلط تھا، اس لیے ۱۹۴۷ء میں ملکی آزادی کے بعد مولانا جب تشریف لائے تو مولانا نے سوچا کہ محض تبلیغ کام نہیں کر سکتی، اب ضرورت ہے ایک نئی تحریک کی ایک نئی ترتیب کی، نئے نظام کی، اس کے لئے مولانا نے ایک نیا رسالہ ''نشان راہ'' کے نام سے لکھا، جس میں ایک طرف یہ پہلو تھا کہ غیر مسلموں سے قریب ہونا چاہیے، انہیں قریب کرنا چاہیے، بات کرنی چاہیے، اور ہمیں اپنی بات ان تک پہنچانی چاہیے، دوسری بات یہ تھی کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے لیے ہمیں ایک ایسا لٹریچر تیار کرنا چاہیے جس سے ہم اسلام پر اعتماد بحال کر سکیں جدید زبان میں جدید اسلوب میں، جو مولانا مودودی کام کر رہے تھے اور بھرپور پیمانے پر کر رہے تھے، اور مولانا نے لکھا کہ میں ان کا معترف تھا، اور ہوں، اور آج جبکہ میں لکھ رہا ہوں کاروان زندگی کی یہ سطریں، میں ان کا معتقد ہوں، میں مغربیت کی تردید، اسلام کی جامع ترجمانی میں ان سے متفق ہوں، اور میرے ان کے ساتھ بڑے خوشگوار اچھے تعلقات ہیں، جب مولانا نے ''دین کی تفہیم و تقسیم کے موضوع پر چار بنیادی اصطلاحات کو موضوع بنایا اور مولانا مودودیؒ کی اصطلاحات کی تفسیر پر تنقید کی تو جس کو ''التفسیر السیاسی'' کے نام سے عربی میں نقل کیا گیا اور میں اس وقت ریاض میں تھا، اور کتاب کے نسخے مجھے بھیجے گئے، اور میں نے ریاض میں اساتذہ اور طلبہ کو تقسیم کیے، ایک بھونچال سا پیدا ہوا، اس بھونچال کا جواب ''الدعوۃ'' پرچے میں مجھے دینے کی نوبت آئی اور مولانا کو وہ ساری خبریں پہنچتی رہیں، تو بہرحال مولانا کا یہ موقف رہا کہ ہمیں اس اسلوب سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کا قیام اسی مقصد کی خاطر ہوا کہ جدید زبان میں جدید وسائل کو سامنے رکھ کر ایسا اسلوب تیار کیا جائے جس سے ہم یونیورسٹی کے فضلاء سے، جدید تعلیم یافتہ طبقے سے بات کر سکیں، ہم ان تک قرآن وحدیث وسیرت اور اسلامی رسائل پہنچا سکیں، ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ سنہ ۴۰ء تک مولانا ندوۃ العلماء کو اپنا مرکز توجہ اس طرح بنائے ہوئے تھے کہ مولانا فرماتے ہیں کہ طلبہ کے سامنے تبلیغ کی تحریک بھی دیکھ کر اور ادھر بھی جا کر میں پورے جوش وخروش سے بیان کرتا تھا، طلبہ کو سبق کیا پڑھاتا تھا بس یہ چاہتا تھا کہ دل پگھلا دوں۔ مجھے کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ در و دیوار میں شگاف پڑ گئے ہوں گے، لیکن طلبہ کے دل پر کوئی اثر نہیں تھا، مولانا نے یہ بات بھی صفائی کے ساتھ لکھی کہ اس وقت تک ندوۃ العلماء میں کوئی دعوتی واصلاحی تحریک نہیں تھی، علمی کام تھا، ادب تھا، تاریخ تھی، مطالعہ تھا، شبلویت کا غلبہ تھا، اور شبلویت کے ترجمان وخلیفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ تھے، ایسے ماحول میں ۳ سال تک مولانا جماعت اسلامی کے ساتھ وابستہ رہے، مولانا نے مولانا مودودی کو ندوہ بلایا، ندوہ میں خطاب ہوا، لکھنو یونیورسٹی میں خطاب ہوا، علی گڑھ میں ایک پروگرام ہوا یونیورسٹی میں مولانا کے ساتھ تشریف لے گئے، وہاں پر بھی یہ پروگرام منعقد ہوا، اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ مولانا زکریا حضرت

مولانا احتشام الحق کاندھلویؒ ان حضرات کو ندوہ کی دعوت دی گئی اور ان کا ندوہ میں تقریبا ۶/۷ دن قیام رہا، علامہ سید سلیمان ندوی بھی اس وقت ندوہ میں تھے، اور ڈاکٹر عبدالعلی بھی استفادہ کے لئے وقتاً فوقتاً حاضر ہوئے تھے، یہ وہ وقت تھا کہ ندوہ میں ایک نئی بہار آئی، اور مولانا چونکہ سنہ ۴۰ سے تبلیغی کام شروع کر چکے تھے، لکھنؤ کے اطراف کے گاؤں اور محلوں میں طلبہ کو لے کر دورہ کرتے تھے، گشت کرتے تھے، اور جمعرات کو نکل جاتے تھے، جمعہ کی رات میں واپس آتے تھے، یہ مولانا کا معمول تھا اور یہ سلسلہ چلتا رہا لیکن آخر پھر وہ وقت آیا کہ مولانا نے محسوس کیا کہ ملک کے حالات بدلے ہوئے ہیں، ایک طرف تحقیقات ونشریات کی مجلس ہونی چاہیے ایک طرف غیر مسلموں کو خطاب ہونا چاہیے، یہ خطاب اس وقت بھی سخت ضرورت بن گیا جب جمشید پور اور راؤڑ کیلا کے فسادات ہوئے، مولانا نے ''پیام انسانیت اور مقام انسانیت'' کے نام سے تقریریں کیں، اس وقت تک پیام انسانیت کے نام سے کوئی تحریک نہیں تھی مولانا نے یہ لکھا بھی ہے کہ میں اس سے بہت محتاط ہوں کہ اس کو تحریک نہیں بنایا جائے، مجھے ڈر ہے وحدت ادیان کا کہیں شوشہ نہ پیدا ہو جائے، لکھا ہے کہ جن کے آثار کبھی کبھی جلسوں میں محسوس ہوتے ہیں، تو اس احتیاط کے ساتھ مولانا کام کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۷۴ء میں میرے سامنے تکیہ کی مسجد کے درخت کے نیچے بیٹھ کر مولانا محمد اسحٰق جلیس صاحب نے تحریک کا خاکہ تیار کیا، میں ان سے بے تکلف تھا، اگرچہ مجھ سے بڑے تھے لیکن ساتھیوں کی طرح بے تکلف بات کرتا تھا، دیکھا میں نے کہ اس وقت تحریک کا خاکہ تیار کیا گیا، سوالات وجوابات طے کیے گئے اور ۱۹۷۴ء کے بعد سب سے بڑا اجلاس پیام انسانیت کا الہ آباد میں ہوا، وہاں سے تحریک کا پھر آغاز ہوا، بہرحال مولانا کے بارے میں تو اتنی چیزیں ہیں کہ میں کیا کیا بیان کروں، لیکن بہرحال میں آپ سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن کاموں میں مولانا بہت پیش پیش رہے، ان میں ۶۰ کی دہائی کی دینی تعلیمی کونسل ہے اور ۱۹۶۴ء کی مسلم مجلس مشاورت اور ۱۹۶۶ء کی مسلم مجلس سیاسی پارٹی ہے، ایک طرف مولانا شریک تھے اور مولانا نے اس تحریک کے لیے اپنی آنکھیں ضائع کر دیں، کاروان زندگی میں لکھا ہے کہ قریب ہی میں آپریشن ہوا تھا، ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ آپ زور نہ دیں، کوئی تقریر نہ کریں، لیکن مسلم مجلس مشاورت کے بعد مولانا نے محسوس کیا کہ مجھے بات کرنی ہے، طبیعت میں جو تاثر جو جوش جو انفعالیت تھی، اس کا نتیجہ تھا کہ مولانا نے ایسی سخت تقریر کی (ہم لوگ تو ۱۲/۱۳ سال کے تھے) ایسی تقریر تھی کہ مولانا جوش میں ڈائس کو پیٹتے تھے، پیر پٹختے تھے، کبھی کبھی اپنی چھڑی کو ڈائس پر مارتے تھے، اور اپنی آنکھ ضائع کر دی جو اس وقت تک ٹھیک نہیں ہوئی، جب تک امریکہ میں بعد میں آپریشن نہیں ہوا، پھر ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی نے سیاسی پارٹی کی تجویز رکھی کہ مسلم مجلس کے عنوان سے ہماری سیاسی پارٹی ہونا ضروری ہے، تو مولانا، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی کے سرپرست تھے، ان کے ساتھ کھڑے تھے اور وہ تقریر اب بھی ہمارے کانوں میں گونج رہی ہے جب مولانا نے اندرا گاندھی کے خلاف جلتی بھنتی اسی طرح کی تقریر بارہ دری میں کی تھی جبکہ زمین پر اپنے پیر پٹخ رہے تھے اور ڈائس پر اپنی چھڑی پٹخ رہے تھے، اس وقت ہم لوگ بچے تھے لیکن پوری سڑک بھری تھی اور ہم لوگ ڈر رہے تھے کہ آج تو مولانا گرفتار ہوں گے، اور یہی مولانا ہیں، جنہوں نے اپنے کو عالم عربی کے لیے وقف کر رکھا تھا، ہندوستان میں مولانا کو جاننے والوں نے بہت بعد میں جانا اور مولانا مرجعیت کی حیثیت اس وقت حاصل کر سکے جب تصوف کی راہ سے وہ سامنے آئے یا مسلم پرسنل لا بورڈ کے راستے سے وہ سامنے آئے اور مولانا زکریا صاحب کے انتقال کے بعد وہ مرجعیت ہوئی، ورنہ آج بھی

میں کہتا ہوں چیلنج کے ساتھ کہ مجھے بتایئے "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" یہاں کے کتنے مسلمانوں نے پہلے پڑھی تھی آج پڑھی ہے، انسانی انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر، سیرت سید احمد شہید اور ماذا خسر.....اور الصراع بین الفکرۃ الاسلامیۃ والفکر الغربیۃ، یہ مولانا کی بنیادی کتابیں ہیں، مولانا کا بنیادی کام پیام انسانیت کے جلسوں کا نہیں، اسکول کا نہیں وہ حاشیہ پر ہے، ۱/ فیصد ہوگا، لیکن جوان کا بنیادی کام تھا، مصر میں جب ۱۹۵۰ء میں جانا ہوا اور احمد الشرباصی نے جنہوں نے مقدمہ بھی لکھا اور مولانا کا تعارف بھی کرایا، مولانا سے یہ سوال کیا گیا کہ آپ کو سب سے زیادہ امید یا چاہت کیا ہے؟ مولانا نے فرمایا ''اسلام کی سربلندی، اسلام کی سربلندی، مولانا کی گھٹی میں پڑی تھی، جب پہنچے تھے تو حسن البناء کو مصر کے مجرموں نے شہید کر دیا تھا۔ ۱۹۴۹ء کا واقعہ ہے یہ۔ مولانا حسن البناء کے والد کی خدمت میں حاضر ہوئے اوران سے ساری تفصیل سنی، مولانا شیخ وحید الحضر می کے ساتھ رہے، محمد الغزالی کے ساتھ رہے، دوستوں کی طرح، عزیزوں کی طرح، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، اور ڈاکٹر احمد العسال جو اس وقت نوجوان طالب علم تھے، اور وہ مولانا کے ساتھ تھے، سفر میں حضر میں رات میں دن میں، ایک طرف مولانا تبلیغ کے نمائندہ تھے اور ایک طرف اخوان تھے جوان کو آغوش میں لے رہے تھے، ان کا استقبال کر رہے تھے، اور دورے کر رہے تھے، اور مولانا نے کسی جماعت و تنظیم کے بارے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ کتنے ہی زیادہ مولانا اس کے عقید تمند ہوں، تبلیغ کے بارے میں تو لکھا ہے کہ مجھے پھر الگ راستہ اختیار کرنا پڑا اور آخر آخر میں مولانا کا حال یہ تھا کہ تبلیغ کے جلسوں میں تقریر کی دعوت دی جاتی تو معذرت کر لیتے تھے کہ میں بیان نہیں کر سکتا، بہت مجبوری میں بہت اصرار ہوتا تو بیان فرماتے، لیکن الاخوان المسلمون کے بارے میں مولانا نے مذاکرہ الداعی والداعیۃ کے مقدمے میں صاف لکھا ہے کہ ''ان سے محبت کرنے والا مؤمن اور ان سے نفرت کرنے والا منافق ہے''۔ یہ صاف الفاظ ہیں جو بدلے نہیں۔ بالکل آخری بیماری میں مولانا نے کہا کہ ڈاکٹر رضوان علی نے اخوان پر کتاب لکھی تھی اور کتاب پر مقدمے کا مطالبہ تھا، میں آج تک نہیں لکھ سکا، یہ قرض ہے اور تم اس پر مقدمہ لکھو، میں کتاب لے گیا، رات میں میں نے اس پر مقدمہ لکھا، دوسرے دن خدمت میں کتاب حاضر کی، مقدمہ پسند فرمایا اور فرمایا کہ تمہاری نگرانی میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام سے یہ چھپے گی، بہر حال کتاب چھپی اور یہ گویا کہ مولانا کی آخری وصیت ہے، مولانا نے حرمین کے حکام کو جو خطوط لکھے اس کے مقدمے میں لکھا بہت طاقت کے ساتھ، ظاہر ہے کہ ان خطوط میں مولانا نے شکایتیں کیں کہ یہاں فحاشی ہو رہی ہے، عیاشی ہو رہی ہے، گندی فلمیں دکھائی جا رہی ہیں، یہاں حاجیوں کا استحصال کیا جا رہا ہے، یہ سب خطوط میں لکھا ہے، اور ایک موقع وہ تھا کہ مولانا نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کیا ہو رہا ہے، فلمی دنیا میں تو طارق العسکری نے کہا کہ ہم آپ کو دکھانا چاہتے ہیں کہ سعودی میڈیا پر کیا ہو رہا ہے، مولانا کو ایک کمرے میں لئے گئے اور انہوں نے پھر چینل دکھائے تو بس پانی پانی ہو گئے، ایسا کہ بس زمین پھٹ جائے اور اس میں گر جائیں، اس کے بعد مولانا نے اتنا سخت اور کھلا مضمون اور طاقتور مضمون لکھا جس کو سعودیہ میں تو شائع نہیں کیا جا سکتا تھا، مصر کے اخوان کے پرچے ''الدعوۃ'' میں اس کو شائع کیا گیا۔ پہلی قسط اس کی جب آئی تو ہم ریاض میں تھے فوراً اس پر پابندی لگی، سارے پرچے دکانوں سے لے لیے گئے اور دوسری قسط پھر مملکت میں داخل نہیں ہو سکی۔ مولانا نے مقدمے میں جو بات لکھی ہے، یاد رکھیے اس کو بھولے گا نہیں فرمایا تھا کہ حضور نے وصیت کی کہ ''اخرجوا الیہود والنصاری/ المشرکین من جزیرۃ العرب'' صاف الفاظ میں اور پھر حضرت عمر نے اس کو پورا

کر کے دکھایا، لیکن آج وہاں ان کے فوجی اڈے قائم ہو رہے ہیں، سرزمین ان کے حوالے کی جارہی ہے، مولانا نے اپنے دل کے دکھڑے کو اور اپنے جگر کے خون کو سامنے پیش کر دیا، کون قبول کرتا؟ وہاں تو ایک دوسرا رخ تھا، اس رخ پر قافلہ جارہا تھا، بحر حال یہ سب مسائل تھے، ملک کا سب سے بڑا مسئلہ شاہ بانو کیس اور بابری مسجد کا مسئلہ مولانا نے کبھی لوگوں سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ سڑکوں پر نکل آؤ، مولانا اس کے قائل نہیں تھے، مولانا اس کے قائل تھے کہ ذمہ داروں، حکاموں، سادھوؤں، سنتوں اور شنکر اچاریہ سے بات کی جائے، لہذا جب مسئلہ شاہ بانو کا تھا تو مولانا نے راجیو گاندھی سے بات کی، اس کو مطمئن کیا، اور جس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ کے ممبران سے فیصلہ لیا گیا اور بل پاس کیا گیا، اور جب مسئلہ بابری مسجد کا آیا تو پھر مولانا کا یہ کہنا تھا بابری ایکشن کمیٹی اپنی بات کہہ رہی تھی، اور مولانا مدراس کے مٹھ کے شنکر آچاریہ سے ملاقات کر رہے تھے، ڈاکٹر یونس سلیم اس میں واسطہ تھے اور دسرے حضرات تھے اور بات طے ہوگئی تھی کہ مسجد محفوظ رہے گی، محکمہ آثار قدیمہ میں رہے گی، وقف کی زمین پر مندر بن جائے گا، لیکن ناک بھوں چڑھانی شروع کی سیاسی بازی گروں نے اور متشدد مولویوں نے جس کے نتیجہ میں مسجد کو نہ محفوظ رکھا گیا، اور نہ مسئلہ کو حل کیا گیا، پھر ایک غول کے ذریعہ مسجد شہید کی گئی، ڈائنا مائٹ سے اڑا دی گئی، ملک میں ہزاروں مسلمان اجودھیا سے لے کر کلکتہ تک اور ممبئی تک سڑکوں پر مارے گئے، عورتوں سے ننگا ناچ کرایا گیا، وہ ظلم ہوا جس کی تاریخ بڑی خونچکاں ہے، آج پھر ہم اسی موڑ پر کھڑے ہوئے ہیں، مسئلہ پھر وہیں ہے، مسائل مدارس کے بھی ہیں، ادب وزبان کے بھی ہیں اور بہت سے مسائل ہیں لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ آج بھی وہی راستہ ہے، راستہ نہ کورٹ کا ہے، کورٹ پر آپ اعتماد کرتے ہیں، جس نے غنڈوں اوباشوں کو پوری بھیڑ کی شکل میں دیکھا کہ وہ چڑھے، انہوں نے گرز مارے اور پھر اتر کر ڈائنا مائٹ سے مسجد کو اڑا دیا گیا، اور پھر فسادات پورے ملک میں ہوئے، کیا کورٹ اندھا اور بہرا ہے، گونگا ہے مفلوج ہے؟ ۲۵ سال ہوگئے، ۲۵ سال تک بابری مسجد کا فیصلہ نہیں ہوا، ابھی کچھ مدت پہلے طے کیا گیا کہ طلاق ثلاثہ کے مسئلے پر سپریم کورٹ کے فیصلہ کا انتظار ہے، کیا فیصلہ مولانا: آیا؟ عادلانہ آیا؟ کیا یہ فیصلہ ظلم پر مبنی نہیں ہے جس نے ۳ طلاق کو معدوم کر کے رکھ دیا اور حملہ کیا اور پارلیمنٹ میں جو بل منظور کیا گیا ہے اس میں حق طلاق کو بھی چھینا جارہا ہے، یہ سب کچھ ہوتے ہوئے اور ووٹ بینک آپ نہیں ہیں، دوسرے ہیں، آپ پر جو کچھ ظلم کیا ہے کانگریس نے کیا ہے، ۱۹۴۹ میں مورتی مسجد میں کانگریس نے رکھوائی اور پھر ۱۹۹۲ میں نرسمہا راؤ کی نگرانی میں مسجد توڑی گئی، سارے مظالم کانگریس کے ہیں، یہ مجرم ہیں انہوں نے مسلمانوں کو ۳۰/۳۱ نمائندگی سے اپنے دور میں ۱٪ تک پہنچا دیا اور سچر کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مسلمان دلتوں اور شودروں سے بدتر ہوگئے، ابھی بھی آپ کو انتظار ہے؟ سپریم کورٹ فیصلہ کرے گا؟ طلاق ثلاثہ کی طرح کرے گا، بابری مسجد کے مسئلہ کی طرح کرے گا، ہم اور آپ جانتے ہیں کہ چار ججز ہندوستان کی تاریخ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے بغاوت کی اور پریس کانفرنس کر کے کچا چٹھا سامنے کر دیا، اس کے بعد بھی ہمارے عمائدین یہ کہیں کہ کورٹ کا انتظار ہے، فیصلہ وہ کرے، یہ ایک بھول بھلیاں ہے، جس میں سفر اندھیر نگری میں لے جائے گا، ہمیں چاہیے کہ آگے بڑھ کر RSS سے VHP سے، بجرنگ دل سے متشدد ہندوؤں سے بات کریں، دعوتی نقطہ نظر سے، انسانی نقطہ نظر سے، اخلاقی نقطہ نظر سے، ملک کے امن وامان کے نقطہ نظر سے، ہم بات کریں۔ اس کے ذریعہ کوئی حل شاید نکل سکے ورنہ سوائے قتل کے اور تباہی کے اور کچھ نظر نہیں آرہا ہے!

☆☆☆

تعلیم و تربیت

تربیت اولاد- چند اہم گوشے

تلخیص وترجمانی
ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

توجہ کی چاہت اور پریشان کن برتاؤ

بچہ کس طرح کے سلوک کی خواہش رکھتا ہے؟

عام طور پر ہر گھر کا یہ قصہ ہے کہ بچے آپس میں لڑتے ہیں، اختلاف کرتے ہیں، تکرار کرتے ہیں، بسا اوقات ان کا آپس جھگڑا والدین کے لیے پریشانی کا سبب بنتا ہے، وہ اس سے عاجز ہوتے ہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے مواقع پر ان کو کیا کرنا چاہیے، عام طور پر اس سے اکثر والدین واقف نہیں ہوتے، اس لیے دیکھا یہ جاتا ہے کہ بچوں کے درمیان جب بھی کوئی جھگڑا ہوتا ہے تو انجام سے بے خبر ہوکر والدین فوراً مداخلت کرتے ہیں، کبھی اگر چھوٹا بچہ اپنے بڑے بھائی کی شکایت کرتا ہے کہ اس نے مارا ہے یا اس کی کوئی چیز لے لی ہے تو عام طور پر ماں فوراً ایک کو غصہ دکھاتی ہے، دوسرے کو دھمکاتی اور ڈراتی ہے، اور پھر دونوں کو بعض ایسے امور کی طرف اشارہ کرکے ڈراتی ہے جن کو وہ عملا کرنہیں سکتی، مثلا کہتی ہے ''میں اب تم سے پیار نہیں کروں گی'' یا کہتی ہے ''میں اب تمہیں اپنے ساتھ بازار نہیں لے جاؤں گی، ماں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ عین اختلاف و نزاع کے وقت ہی وہ معاملہ بالکل سلجھا دے، اس رویہ اور خطا کی مکمل تصحیح کردے۔

اہم بات یہ ہے کہ بچوں کو اپنے والدین کے ردعمل کے متعلق مکمل طور پر علم ہونا چاہیے کہ ایسا ہوگا تو ماں یا باپ کا ردعمل کیا ہوگا، چنانچہ تجربات کی روشنی میں بچے اس کو سیکھا کرتے ہیں، سابقہ تجربات کی روشنی میں وہ یہ بھی سیکھ لیں گے کہ والدین کو اپنے اس آپسی جھگڑے میں کس طرح شریک کریں، کیوں کہ بے سوچے سمجھے متعدد مرتبہ کے ایسے ردعمل سے ان پر یہ امر منکشف ہوہی جائے گا، جو نہ ہی مؤثر ہوگا اور نہ ہی مشکل کا حل، البتہ بچے یہ ضرور سیکھ لیں گے کہ والدین کی توجہ کیسے حاصل کر لیں، کیوں کہ بچہ کو اس کا خوب علم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مشکلات و مسائل کی جانب اپنے والدین کی توجہ کیسے مبذول کرائے، اس لیے اگر والدین کا ردعمل ہمیشہ ایسے ہی غیر موثر ہوگا تو اس کی مثال ایسی ہوگی کہ گویا بجلی کے پنکھے کا بٹن دیا جائے گا، اور پنکھا اپنی روش پر چلنے لگے گا، اس صورت میں بچہ والدین کو اس حال میں پہنچا دے گا، کہ وہ کبھی جھگڑیں گے، کبھی لکچر دیں گے، کبھی چیخیں اور چلائیں گے اور کبھی اس کے ساتھ مار پیٹ کر بیٹھیں گے، کبھی کبھی تو یہ سب کچھ محض اس کے اپنی ضروریات پوری نہ کرنے کے سبب ہوگا، اور کبھی اس کا سبب وہ امور بنیں گے جن کے متعلق والدین چاہتے ہیں کہ بچہ انھیں خود انجام دے، بچے کے بُنے ہوئے اس جال میں روز کئی لوگ پھنسیں گے اور انھیں اس کا احساس بھی نہیں ہوگا، اس طرح خود اہل خانہ اس غلط رویہ کو پروان چڑھانے میں اپنے غلط طریقہ کار کی بنا پر خود ہی سبب بنیں گے، کیوں کہ وہ بار بار اس طرح کا سلوک کریں گے اور بچے کے ایسے تصرفات پر خوب توجہ دیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ بچہ والدین کی توجہ حاصل کرنے کے بعد چند منٹوں کے لئے تو

خاموش رہے گا، لیکن پھر تھوڑی دیر بعد وہ نیا جھگڑا کردے گا اور کوئی نیا اختلاف برپا کرے گا کیوں کہ اس کو یہ یقین ہو چکا ہوگا کہ وہ اس طرح بڑوں کی توجہ حاصل کرلے گا اور بڑے اس کی حوصلہ افزائی کریں گے۔

بچہ غلط برتاؤ کیوں کرتا ھے؟

انسان کے لیے یہ بات ضروری بھی ہے اور مفید بھی، کہ وہ بچے کے غلط رویہ اور ناروا سلوک کے اسباب و وجوہات اور مقاصد کے سلسلہ میں غور کرے، ہمارے نزدیک ناروا سلوک کا مطلب دوسروں کا احترام نہ کرنا ہے، کبھی کبھی بچہ اس لیے بھی ایسا کرتا ہے کیوں کہ اس کو اپنی زندگی میں مشکلات کا احساس ہوتا ہے، اپنی ذات کے سلسلہ میں اس کو منفی احساس ہوتا ہے، اگر بچے کی عمر کے سابقہ مراحل پر غور کرلیا جائے تو یہ بات مزید واضح ہوجائے گی، جب بچہ کو کوئی مشکل پیش آتی ہے تو چھوٹی عمر کے بچوں کی طرح عمل کرتا ہے، جیسا کہ اس نے بچپن میں سیکھا ہوتا ہے، برتا ہوتا ہے، مثلا چھوٹے بچہ کو جب اپنے خوف، پریشانی یا تنہائی کا احساس ہوتا ہے تو وہ رونے کا سہارا لیتا ہے، یا ایک بچہ جس طرح کا بھی برا سلوک کرسکتا ہے وہ کرتا ہے۔

اس پریشان کن رویہ یا غلط برتاؤ کے عام طور پر پانچ اسباب و مقاصد ہوسکتے ہیں۔

۱۔ دوسروں کی توجہ حاصل کرنا، اپنے مسائل میں سب کو مشغول رکھنا۔

۲۔ تسلط و غلبہ کے لیے جھگڑنا، یعنی بچے کا خود ہی اپنے امور انجام دینے کی کوشش کرنا۔

۳۔ انتقام، یعنی بدلہ لینے کے لیے دوسروں کو تکلیف پہنچانا اور عاجز کرنا۔

۴۔ سرینڈر کرکے عجز و کمزوری کا اظہار کرنا۔

۵۔ اپنے دوستوں کی تائید و توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا، اگرچہ یہ بھی اول الذکر کے قبیل سے ہے، ذیل میں ہم ان تصرفات کی بعض مثالیں دے کر وضاحت کریں گے اور بتائیں گے کہ ایسے مواقع پر والدین کو کیا رویہ اپنانا چاہیے۔

توجہ حاصل کرنا:

مثلا تین سال کا بچہ توجہ حاصل کرنے کے لئے کھانا زمین پر پھینکتا ہے، جیسے ہی وہ کھانا پھینکتا ہے اس کی ماں چیختی ہے ''یہ نہ کرو بیٹا''، لیکن وہ پھر کچھ دیر کے بعد یہی حرکت کرتا ہے، اور ماں پھر وہی بات دوہراتی ہے، اس طرح وہ جس قدر ماں کی توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے، ماں اپنے سلوک سے اس کی اس چاہت کو پورا کرنے میں اس کا تعاون کرتی ہے۔

توجہ حاصل کرنے کے بہت سے طریقے ہیں، بعض بچے توجہ حاصل کرنے کی خاطر سزا جھیلنے اور مار کھانے تک کو تیار رہتے ہیں، کیوں کہ ان کو توجہ یا بعض اشیا سے فائدہ اٹھانے کے سلسلہ میں محرومی کا احساس دامن گیر ہوتا ہے، اس لیے اس پر غور کرنا چاہیے کہ اگر بچے کے پریشر میں آکر اس کے رونے دھونے کے سبب اس پر توجہ دی گئی تو اس کے بعد کیا ہوگا، اس کے بعد یہ ہوگا کہ والدین کے غلط رویہ کے سبب چند منٹ یا تھوڑی دیر تو وہ خاموش رہے گا، پھر وہی حرکتیں شروع کردے گا، اگر والدین توجہ نہیں دیں گے تو وہ دوسروں کی توجہ حاصل کرے گا، اس لیے والدین کو یہ سمجھنا چاہیے کہ ایسے مواقع پر وہ بچے کی خواہش کو نظر انداز Ignore کریں، یہی بہتر اور افضل طریقہ ہے کہ جب بچہ ضد، الحاح و زاری اور غلط طریقہ سے متوجہ کرنا چاہے یا کوئی خواہش پوری کرانا چاہے تو بڑوں کو چاہیے کہ اس سے صرف نظر کریں، بچہ ان حرکتوں کے ذریعہ بڑوں سے جس چیز کی توقع کر رہا ہے، بڑوں کو چاہیے کہ اس وقت اس کی توقع کے خلاف عمل کریں، البتہ والدین کا صحیح کردار اس سلسلہ میں یہ ہے وہ عام حالات میں بچے پر توجہ دیں، اس کو کہانیاں سنائیں، قصے سنائیں، اس کے ساتھ کھیلیں، اٹھکھیلیاں کریں، اس طرح بچے کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ والدین کی توجہ حاصل کرنے کے لئے صحیح طریقے بھی ہیں جن کے ذریعہ بغیر روئے دھونے اور چیخ و پکار مچائے

والدین کو اپنی جانب متوجہ کیا جا سکتا ہے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کرائی جاسکتی ہے۔

بالادستی اور تسلط کی کشمکش:

مثلا ایک بچی دس سال کی ہوگئی، لیکن جب اس سے کسی کام کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ اس کے لیے بڑی مشکل سے آمادہ رہتی ہے، یا نہ کرنے پر اصرار کرتی ہے، خاص طور پر جب اس کے والد اس سے کسی کام کا مطالبہ کرتے ہیں تو صورتحال زیادہ گمبھیر ہوجاتی ہے، پھر ایک بحث ومباحثہ اور جنگ وجدال کا سا ماحول پیدا ہوجاتا ہے، جس سے پورے گھر کا ماحول متاثر ہوتا ہے۔

عام طور پر اس صورت حال کے پیچھے بالادستی وقدرت کے حصول کا عنصر کارفرما ہوتا ہے، بچہ اس کو حاصل کرنے کے لئے نزاع کی کوشش کرتا ہے، وہ کسی طرح کی تنبیہ وتصحیح کو قبول نہیں کرنا چاہتا، اور غالب گمان یہ بھی ہوتا ہے کہ بچہ تنبیہ وتصحیح کے عمل سے واقف نہیں ہوتا، اس لیے اس کا رویہ مزید خراب ہوجاتا ہے، حتی کہ اگر وہ والدین کا مطالبہ پورا کردے، مطلوب کو انجام دے دے تب بھی اس کے اندر مخالفت اور سرکشی کے جذبات باقی رہتے ہیں۔

عام طور پر ایسی صورت میں اپنی بالادستی کو باقی رکھنے کے لئے جدال سے گریز کرنا چاہیے، کیوں کہ اس کے برے اثرات بہت دوررس ہوتے ہیں اور دیگر امور پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اس لیے ایسے موقع پر والد کو چاہیے کہ وہ بیٹی کے کمرے سے یہ کہتے ہوئے نکل جائیں ''ٹھیک ہے ہم اسی مسئلہ پر آپ سے بعد میں بات کریں گے، جب کہ ہم دونوں مطمئن اور پرسکون ہوں گے، پھر یہ ضروری ہے کہ آئندہ کسی وقت خوشگوار ماحول میں والد بیٹی سے اس سلسلہ میں گفتگو کریں۔

انتقام:

مثلاً ایک آٹھ سال کا بچہ ہے، وہ اپنے بعض افعال سے والدین کو ستاتا ہے، جیسے کہ جب بھی اس کو کوئی ایسا کھانا دیا جائے جو اس کی نظر میں بے کار و بدمزہ ہو تو وہ بار بار اس کی برائی کرتا ہے، پھر جب اس کے والد اس کو اس طرز کلام سے روکتے ہیں، تو اس کے اندر معاندانہ جذبات پیدا ہوجاتے ہیں، پھر تو وہ کھانے کے وقت کو والدین کو ستانے کے لیے بہترین موقع سمجھتا ہے اور اس طرح اپنے آپ کو غالب کرنے یا اپنی کامیابی کے لیے وہ ایک طریقہ ایجاد کرلیتا ہے، پھر وہ لاشعوری طور پر والدین سے انتقام لینے لگتا ہے۔

لیکن جب والدین ہمیشہ ہی قدرت وتسلط کی کشمکش میں بالا دست رہتے ہیں، بالآخر بات ان ہی کی چلتی ہے، تو پھر بچے دوسرے نئے طریقے ایجاد کرتا ہے، ان کو تکلیف پہنچانے اور ستانے کے دوسرے راستے تلاش کرتا ہے، اس طرح وہ والدین کو جلد ہی توجہ دینے پر مجبور کرتا ہے، لیکن یہ جدال اور عمل وردعمل کی مہم بے نتیجہ ہی ہر مرتبہ ختم ہوتی ہے اور بچہ ستانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کرتا رہتا ہے، اسی لیے اصولی بات یہ ہے کہ بچے کے ساتھ ٹکراؤ اور تضاد کا طریقہ کبھی بھی نتیجہ خیز اور مفید نہیں ہوتا۔

اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس طرح کی صورت حال بڑی مشکل اور پیچیدہ ہوتی ہے، لیکن اگر والد اپنی دانشمندی اور قوت برداشت سے کام لیتے رہیں تو جلد ہی وہ اس کشمکش کی شدت اور متنفر حالت پر قابو پالیں گے اور اسے ختم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے، سوال یہ ہے کہ ایسے بچے کے ساتھ کرنا کیا چاہیے؟ اس کا جواب بہت آسان ہے، صرف اپنی بات منوانے کی نفسیات سے گریز اس مسئلہ کا آسان حال ہے، مثلا بچہ کسی کھانے کو دیکھتے ہی اس کی برائی شروع کردیتا ہے، تو ابا حضور کو چاہیے کہ بہت سکون سے کہیں ''لگتا ہے ہمارے بیٹے زید کو یہ کھانا پسند نہیں ہے، چھوڑ دو بیٹے تم اس کو نہ کھاؤ''، اور پھر دوسرا موضوع چھیڑ دیں، گفتگو کا رخ تبدیل کردیں۔

ظہار عجز و کمزوری:

مثلا پانچ سال کی بچی ہے، وہ روز صبح اپنے کپڑے پہننے میں بڑی دیر لگاتی ہے، بٹن وغیرہ لگانے میں اپنے عجز کا اظہار کرتی

ہے، پھر وہ اپنی ماں کے ساتھ جھگڑا شروع کرتی ہے، ماں جلدی سے دوڑ کے آتی ہے اور اس کو کپڑے پہنا دیتی ہے، بٹن وغیرہ لگا دیتی ہے، اس طرح یہ بچی سمجھ جاتی ہے کہ وہ جب بھی اپنے عجز اور عدم قدرت کا اظہار کرے گی، اماں فوراً متوجہ ہو جائیں گی، اور اس کے کام کو انجام دے دیں گی، جبکہ اس کے لیے یہ بات پوری طرح ممکن تھی کہ وہ اپنے کپڑے خود اپنے ہاتھ سے پہن لے۔

عام طور پر اس طرح کے عجز کا اظہار وہ بچہ کرتا ہے جس کو اپنے آپ پر اعتماد نہیں ہوتا، جو تردد کا شکار ہوتا ہے، پھر ہوتا یہ ہے کہ یا تو والدین اس کو ملامت کرنے لگتے ہیں، یا پھر جلدی کرنے کے لئے اس کی مدد کرتے ہیں اور جو کام اس کو خود کرنا تھا وہ والدین انجام دیتے ہیں، اس طرح وہ اس کے مظاہر عجز پر توجہ دیتے ہیں، پھر یہ مشکل حل ہونے کے بجائے مزید پیچیدہ ہوتی جاتی ہے، بچہ کے اندر عجز و کمزوری کا احساس مزید بڑھتا ہے، پھر وہ آسانی سے آگے نہیں بڑھتا اور اس کے اندر بہتری نہیں آتی۔

اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ بچہ جب عجز و کمزوری کا اظہار کرے تو ہم اس کی جانب توجہ نہ دیں اور نہ ہی اس کی رعایت کریں، البتہ یہ ممکن ہے کہ اس کی کچھ حوصلہ افزائی کر دیں، اس کو مزید درست کرنے اور اچھے طریقہ سے کپڑے وغیرہ پہننے میں کچھ مدد کر دیں، یعنی ہلکی پھلکی کوشش والدین کی شامل ہو، باقی وہ اپنے ذمہ کا کام خود انجام دے، اور اس کو قطعی یہ احساس نہ ہو کہ جب اس نے اپنی بے بسی اور کمزوری کا اظہار کیا تو والدین نے اس پر توجہ دی۔

دوستوں کی چاہت:

ایک بچہ پندرہ سال کا ہو جاتا ہے، وہ رات کو دیر سے گھر آتا ہے، باوجود اس کے کہ والدین بار بار اس کو ٹوکتے ہیں، تنبیہ کرتے ہیں، سمجھاتے ہیں مگر اسی طرح اس کا وقت برباد ہوتا رہتا ہے اور وہ والدین کی بات پر توجہ نہیں دیتا۔

حقیقت یہ ہے کہ عمر بڑھنے کے ساتھ یا نوجوانی میں بچے کے اندر دوستوں کی چاہت ان سے آگے بڑھنے، ان کو متاثر کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے بچہ کچھ اس طرح کے غلط رویّے بھی اپناتا ہے، جو گھر والوں کے لئے پریشانی کا باعث ہوتے ہیں، اور گھر والوں کو کچھ خدشات لاحق ہو جاتے ہیں، اس کے نتیجہ میں روزانہ بحث مباحثہ، پوچھ تانچھ اور تکرار کا معمول بن جاتا ہے۔

اس صورت میں اگر والد بچے کو اس کے دوستوں کے سامنے کچھ کہہ دیں تو اس کے اندر بدسلوکی کی نفسیات پیدا ہوتی ہیں، اور اسے غصہ آتا ہے، جس سے اس کی سرکشی اور عداوت میں مزید اضافہ ہوتا ہے، اس لیے ایسے موقع پر نظر انداز کرنا بہتر ہوتا ہے کہ اس وقت بات ٹال دی جائے اور پھر کسی وقت بات کی جائے، اور گھر سے باہر بچہ کی جو سرگرمیاں ہوتی ہیں ان سے متعلق کچھ اہتمام بھی کیا جائے، پھر آئندہ والد کے لیے اس کا علاج ممکن ہوگا، آئندہ صفحات میں ''تادیب'' کے زیر عنوان اس سلسلہ میں مزید گفتگو ہوگی۔

بڑوں کے اسلوب میں تبدیلی کی ضرورت:

کچھ ایسے اسباب ہوتے ہیں جو بچے کو غلط رویّہ اور ناروا سلوک کرنے کا عادی بنا دیتے ہیں، پھر وہ بذات خود ان افعال کو انجام نہیں دیتا بلکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کی حقیقت کا اسے ادراک بھی نہیں ہوتا، بچے کی طرف سے جب کسی غلط رویے اور نامناسب سلوک کا سامنا ہو تو بڑوں کو خود اپنے آپ سے سوال کرنا چاہیے کہ ''ایسے موقع پر خود میرے احساسات کیسے ہوتے؟''، ان ہی احساسات کا ادراک مذکورہ بالا پانچوں امور کی تعیین میں صحیح کردار ادا کرے گا، مثلاً بڑے محسوس کرتے ہیں کہ بچہ عاجز کرتا ہے، تو اس کا احتمال ہے کہ وہ توجہ کا طالب ہو، اگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ بچہ غصہ کا احساس کر رہا ہے تو احتمال ہے کہ وہ غلبہ و قدرت کے اظہار کے لیے غصہ دکھا رہا ہو، اگر بڑے یہ محسوس کرتے ہیں کہ بچہ کچھ برا سلوک کر رہا ہے یا تکلیف پہنچا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ بڑوں سے انتقام

لینا چاہتا ہے، اسی طرح اگر بڑے بچہ میں عدم قدرت اور عجز و کمزوری محسوس کررہے ہیں تو یہ علامت ہے کہ وہ عجز وضعف کو ظاہر کررہا ہے، اگر بچہ اضطراب وخوف کا اظہار کررہا ہے تو اس کا مطلب کہ وہ دوستوں کی توجہ چاہتا ہے اور ان سے اپنی تعریف سننے کا خواہاں ہے۔

اس لیے اہل خانہ کے لیے اہم بات یہ ہے کہ وہ ان احتمالات پرغور کریں جن کو بچہ حاصل کرنا چاہتا ہواوراس کے لیے ہی یہ سب کچھ کرتا ہو، اس طرح وہ بچے کو کسی خطرہ اور دھوکہ میں پڑنے سے بچا سکتے ہیں، اور بچہ کو حسب سابق اور متوقع ردّعمل سے باز رکھ سکتے ہیں، دراصل بعض لوگوں کے نزدیک ان احتمالات میں غور وفکر والدین کی جانب سے موثر و فعال تربیت کی شرط اول ہے۔

اس کا بھی لحاظ ضرری ہے کہ ان سب کو کوششوں کے بعد بھی اگر والدین کو بچے کی جانب سے حسب سابق سلوک کا سامنا ہوتو ایسے موقع پر مثلا اگر والد چیختے تھے، ڈانٹتے تھے، تو ان کو چاہیے کہ اس سے گریز کرتے ہوئے غیر متوقع طور پر اطمنان کا اظہار کریں، اگر پہلے سے ہی وہ سکون واطمینان کے عادی ہیں تو مزید عقلمندی اور پختگی کے ساتھ اطمنان کا مظاہرہ کریں، کوشش یہ کریں کہ بچہ اگراس ناروا سلوک کے ذریعہ توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس پر بالکل توجہ نہ دیں، اسی طرح اگر محسوس ہو کہ بچے آپس میں کچھ بحث مباحثہ کررہے ہیں اور جھگڑا کررہے ہیں تو بڑوں کو ابتدا میں نظرانداز کرنا چاہیے، لیکن اگر والد کو لگے کہ کچھ ڈانٹنا اور سمجھانا ضروری ہے تو پھر مثبت اور اچھے انداز میں اس طرح تنبیہ کریں کہ اس کو تنبیہ بھی ہوجائے اوراس کی دل شکنی بھی نہ ہو، لیکن یہ تب ہی ہو جب کسی بڑے خطرہ کا اندیشہ ہو ورنہ ابتدائی طور پر تو بچوں کے آپسی جھگڑے اور جدال کونظرانداز کرنا چاہیے۔

سطور بالا کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ والدین کو اپنے سلوک کے بارے میں غور وفکر کرنا چاہیے، اپنے غیر موثر طریقوں کو تبدیل کرنا چاہیے جن کے بارے مین عام طور پر وہ غور نہیں کرتے، بلکہ بچوں کی تربیت کا عمل وہ ارادی طور پر انجام نہیں دیتے، وہ تو یوں ہی دیکھا دیکھی کا ایک عمل ہوتا جو حسب رواج چلتا رہتا ہے، البتہ والدین اپنے طریقہ تربیت میں مذکورہ بالا طریقہ سے تبدیلی کرکے بچوں کو منحرف طریقوں اور غلط رویّوں سے باز رکھ سکتے ہیں۔

ساتھ میں وقت گذارنا:

اس کتاب میں یا تربیت اولاد سے متعلق دیگر کتابوں میں بھی آپ یہ پائیں گے کہ والدین کو بچوں کو برتنے اوران کی تربیت کرنے کے لیے مہارت اور تجربات حاصل کرنے کی تاکید کی جاتی ہے، لیکن یہاں ہم ایک بنیادی نکتہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، جس کو ہمیں کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے، بچوں کے تئیں ہماری بنیادی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم ان سے محبت کریں، اس محبت کا اظہار کریں، ان کے ساتھ وقت گذاریں، کوئی وقت ان کے ساتھ گفتگو کے لیے ہونا چاہیے، کوئی وقت ان کی باتیں سننے کے لیے ہونا چاہیے، رات میں ان کے ساتھ کچھ بات چیت، کچھ ہنسی مذاق اور کچھ کھیل ہونا چاہیے، کسی وقت ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے، کسی وقت ان کے اندر اعتماد پیدا کرنے کی کوئی کوشش کرنا چاہیے، کبھی ان کے ساتھ کچھ کھانا پینا چاہیے، کسی وقت ان کو دکھانا چاہیے کہ ہم ان پر کتنی شفقت کرتے ہیں اوران کے تئیں ہمارے احساسات کیا ہیں۔

بچوں پر مثبت طریقہ سے توجہ دینا اور مطلوب صحت کا خیال رکھنا تربیت کے اہم اور مؤثر اصولوں میں شمار کیا جاتا ہے، اوپر جس چیز کا ذکر کیا گیا یعنی متوقع ردعمل کے برخلاف غیر متوقع طریقہ اختیار کرنا، وہ بھی بہت اہم نکتہ ہے، اس کے ساتھ اس اصول کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے۔

آپ اپنے آپ کو پہچان لیں! تو بچہ کو بھی پہچان لیں گے!

درج ذیل مثالوں کو پڑھیے اوراس کی تعیین کیجیے کہ ان میں سے کون سی چیز ہے جس کے ذریعہ بچہ آپ کو پریشان کرتا ہے۔

- صبح جلدی بستر نہیں چھوڑتا ہے۔
- خود سے اپنے کپڑے نہیں پہنتا، اور پہنتا ہے تو صحیح سے نہیں پہنتا۔
- صبح خود سے اپنا منہ نہیں دھوتا، ہمیشہ یاد دہانی کی ضرورت پڑتی ہے۔
- ہمیشہ دروازہ کھلا چھوڑ دیتا ہے۔
- جب کھانا کھاتا ہے تو زمین پر گراتا ہے۔
- جب دسترخوان پر بیٹھتا ہے تو کھانے کے آداب کی رعایت نہیں کرتا۔
- جب آپ اسے مخاطب کرتے ہیں تو بغیر احترام کے جواب دیتا ہے۔
- ہمیشہ جھگڑتا ہے اور دوسرے بھائی بہنوں کو چھیڑتا ہے۔
- جب کچھ چاہتا ہے تو غصہ یا گھبراہٹ کا اظہار کرتا ہے یا چیختا چلاتا ہے۔
- چھوٹی سی چیز کے لیے بھی شکایت کرتا ہے اور پریشانی کا اظہار کتا ہے۔
- اگر کوئی کام کرتا ہے تو بہت سستی سے کرتا ہے۔
- دسترخوان پر آنے میں دیر لگاتا ہے۔
- کھانا بہت آہستہ کھاتا ہے یا کھانا کھاتے ہوئے ادھر ادھر گراتا ہے۔
- اپنا ہوم ورک کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہے، یا پھر بہت جلدی کرتا ہے۔
- گھر میں دوسروں کے ساتھ تعاون نہیں کرتا۔
- ٹی وی کثرت سے دیکھتا ہے۔
- دوسرے بچوں کو پریشان کرتا ہے، ان پر اپنا زور آزماتا ہے، ان کے سامنے اپنی قوت کا اظہار کرتا ہے۔
- اپنی گفتگو میں جھوٹ بولتا ہے۔
- اگر کوئی اہم بات ہو تو گھر والوں کو اس کی اطلاع نہیں دیتا۔
- مناسب وقت پر سونے کے لئے بستر پر نہیں جاتا، اور اگر بستر پر جاتا ہے تو زیادہ دیر رکتا نہیں۔
- دوسروں کا احترام نہیں کرتا۔
- دوسرے بچوں کے ساتھ نرمی سے نہیں ملتا جلتا۔
- ہمیشہ گھر کے بستر اور دوسری چیزوں پر اچھل کود کرتا ہے۔
- دیواروں پر لکھتا ہے۔
- ہمیشہ اس کا مزاج بدلتا رہتا ہے، کبھی کبھی اس پر اکتاہٹ کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔
- دیر تک گھر سے باہر رہتا ہے۔
- یا اس طرح کی اور دوسری چیزیں ہیں.....

اب جب آپ بچہ کے اس رویہ پر غور کرلیں جو آپ کے لیے پریشان کن ہے، تو پھر اس پر غور کیجئے کہ اس کے بالمقابل عادتاً آپ کا کیا برتاؤ ہوتا ہے؟ آپ اس کو کس طرح برتتے ہیں؟ کیا مار پیٹ کرتے ہیں؟ یا نظر انداز کرتے ہیں؟ یا چیختے چلاتے ہیں، یا جھگڑتے ہیں؟ یا عملی طور پر بچے کو کسی کام میں لگا دیتے ہیں؟ یا اس کو ڈراتے دھمکاتے ہیں؟ یا اس کو بعض لبھانے والی چیزوں مثلاً مٹھائی چاکلیٹ وغیرہ سے محروم کر دیتے ہیں؟ یا پھر مطلوب عمل کو انجام دینے کے لئے، اس سے کچھ اظہار محبت کرتے ہیں، اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، ڈھارس بندھاتے ہیں؟ اس کو ترغیب دیتے ہیں یا بدلہ میں کچھ دینے کی امید دلاتے ہیں.....؟

ان میں سے آپ جو بھی طریقہ اختیار کرتے ہوں، اس کے برخلاف اگر آپ نیا طریقہ اختیار کرنا چاہیں تو اس کی کیا شکل ہوگی جو زیادہ مناسب ہو، کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ دوسرے ایسے طریقوں کے بارے میں سوچیں جو زیادہ مفید و مؤثر ہوں؟

عملی مواقف اور مثالیں:

اس فصل کے آخر میں ہم کوشش کریں گے کہ ہر اس رویہ کی ایک عملی مثال پیش کر دیں، جس کے علاج میں عام طور پر والدین کو پریشانی و دشواری ہوتی ہے، ہماری کوشش ہوگی عام روش سے ہٹ کر ہم نئے طریقہ کی نشاندہی کریں جو کہ اس عام طریقہ سے کلی طور پر مختلف ہو جس کو عام طور پر والدین اپناتے ہیں، اس کی

یقینی طور پر ضمانت نہیں دی جاسکتی کہ طریقہ تبدیل کر لینے سے مکمل طور پر کامیابی مل ہی جائے گی، البتہ اپنے حصہ کی کوشش کی تکمیل ضرور ہوجائے گی، اور یہ بھی طے ہے کہ اگر ہم کو طریقہ تبدیل کرنے سے کوئی کامیابی نہ بھی ملے تو یقینی طور پر کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔

ہم نے سابقہ تجربات سے یہ سیکھا ہے کہ نئے طریقوں کو برتنے میں ہم جس قدر باریک بینی سے کام لیتے ہیں، اسی قدر بہتر نتائج ظاہر ہوتے ہیں، ہمارا یہ بھی تجربہ رہا ہے کہ خاص خاص نقاط کو لکھ لینا چاہیے، اور نئے طریقوں کو برتنے کے لیے جو مطلوبہ اقدامات ہوں ان کو تحریر میں لے آنا چاہیے۔

ذیل کے نقاش کو پڑھیں اور پھر جو سوالات پیدا ہوں ان پر غور کریں:

ماں: (ذرا پریشان ہوکر کہتی ہے) عدنان تم سے کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ گھر کے اندر اس طرح سے اپنا اسکول بیگ نہ رکھا کرو، اسی طرح دیکھو تم نے اپنے اسکول کا کوٹ کہاں رکھا ہے۔

عدنان: (ذرا غصہ میں جواب دیتا ہے، کہتا ہے) دو منٹ رکیے میں ابھی یہ سب اٹھا لیتا ہوں۔

(پھر آدھے گھنٹہ بعد)

ماں: (ذرا غصہ سے) میں سمجھ رہی تھی کہ تم نے اپنے یہ چیزیں اٹھالی ہوں گی، اور کمرہ مرتب و منظم کرلیا ہوگا۔

عدنان: آپ ہمیشہ بار بار یہی دوہراتی ہیں ''یہ کرو، وہ کرو'' میں نے کہہ دیا نہ کہ میں یہ چیزیں اٹھالوں گا، مگر ذرا مجھے موقع تو دیجیے۔

ماں: (غصہ کا اظہار کرتے ہوئے) دیکھو اگر اب تم نے جلدی سے اپنا بیگ اور اپنا سامان نہ اٹھایا تو دیکھنا میں کیا کرتی ہوں، میں تمہیں آخری وارننگ دے رہی ہوں۔

بالآخر ڈانٹ ڈپٹ، بحث وتکرار اور ردوکد کے بعد عدنان اپنا بیگ اور کوٹ اٹھا تو لیتا ہے مگر اس کو مرتب کر کے کمرے میں نہیں رکھتا، بلکہ کمرے کے باہر گیلری میں ڈال دیتا ہے۔

اس آخری مرحلہ تک پہنچ کر ماں کا غصہ کچھ زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ مستقل اپنے بچے کے ساتھ الجھنے لگتی ہے، غلبہ وتسلط اور برتری کے لیے کشمکش جاری ہوجاتی ہے۔

اس منظر نامہ کو ملاحظہ کرنے کے بعد کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ آپ ماں کے غیر مؤثر کردار کو پکڑ سکیں جس کو اس نے مشکل کو حل کرنے کے لیے استعمال کیا، کیا آپ سمجھ سکے کہ آخر کس طرح ماں نے بچہ کو اس ناروا سلوک کو مسلسل برتنے پر حوصلہ افزائی کی اور اس کو اس کا احساس بھی نہ ہوا۔

ذرا اب ایک دوسرا منظر دیکھیے:

والد: ارے بھائی اتنی دیر ہوگئی تم دونوں ابھی تک بستر پر نہیں گئیں؟ چلیے دونوں لوگ اپنے بیڈروم جایئے اور جاکے سوجایئے۔

لیلی: لیکن ابو جان نور نے بہت زور سے میرے بال کھینچے ہیں۔

والد: کیوں نور تم نے اپنی بہن کے بال کھینچے ہیں۔

نور: قطعی میرا ارادہ اس کے بال کھینچنے کا نہیں تھا۔

لیلی: ہاں ہاں تم نے بالقصد میرے بال کھینچے ہیں۔

نور: نہیں میں نے ایسا نہیں کرنا چاہا تھا، تم دراصل زور زور گنگنا رہی تھیں اور میں سو نہیں پا رہی تھی۔

والد: (ذرا غصہ میں) مجھے نہیں معلوم کہ تم دونوں میں کون خطا وار وسزاوار ہے مگر نور تم اپنی بہن سے بڑی ہو، تمہاری ذمہ داری ہے کہ تم تمام معاملات میں اس سے زیادہ توجہ اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرو، چلو اب فوراً دونوں اپنے بیڈروم جاکر سوجاؤ، اگر اب میں نے تم دونوں کی آواز سنی تو میں تمہاری تادیب کے لیے آؤں گا۔

ہم نے دیکھا کہ والد اس صورت حال سے کس قدر پریشان ہوگئے اور دونوں بچیاں ان کی توجہ حاصل کرنے کے اپنے مقصد میں کامیاب رہیں۔

اب ایک اور منظر ملاحظہ کیجئے:

سمیر: (اپنے دوست علاء کے ساتھ ہنسنے کھیلنے میں مصروف ہوتا ہے) اس دوران اس کے ہاتھ سے دودھ کا گلاس چھوٹ کر گر جاتا ہے۔

ماں: (ذرا پریشان ہوکر) دیکھو تم نے کیا کیا ہے اس وقت، تم کو آج یہ کر کے کیا حاصل ہوا؟ دیکھو تم تو عام طور پر شام کو بہت سکون سے کھانا کھاتے ہو مگر آج یہ کیا کر دیا؟

سمیر: (ماں کی مخالفت کرتے ہوئے کہتا ہے) ہرگز نہیں! میں تو کبھی سکون سے کھانا نہیں کھاتا، اور ہاں یہ گلاس بد بخت بہت چھوٹا ہے، بڑی آسانی سے ہاتھ سے پھسل جاتا ہے اور زمین پر گر جاتا ہے،

ماں: (ذرا غصہ میں) سمیر مجھ سے اس انداز میں بات مت کرو، سمجھے تم!

سمیر: (ماں کی تقلید کرتے ہوئے) سمجھ گیا ماں، سمجھ گیا، ارے سمجھ گیا (اس کی ہنسی اور بڑھ جاتی ہے)۔

ماں: (غصہ کا اظہار کرتے ہوئے) جاؤ اب اس وقت اپنے بیڈروم میں جا کے سو جاؤ، میں تمہیں دیکھنا نہیں چاہتی۔

سمیر: بہتر ہے، میں جاتا ہوں، مجھے آپ کے اس کھانے کی ضرورت نہیں، آؤ علاء ہم لوگ اپنے کمرہ میں چلتے ہیں۔

آپ کی نظر میں سمیر یہ رویہ کیوں اپناتا ہے؟ اور وہ کیا وجوہات ہیں جن کے سبب اس موقف و رویّہ کی اصلاح کے لیے ماں کے اقدامات غیر موثر ہوتے ہیں۔

اھل خانہ کے لیے نصیحتیں:

(پہلا جدول دیکھیے)

اگر بچہ ہمہ وقت پریشان رہے، تنگی محسوس کرے اور اپنے سلسلہ میں منفی ہی سوچ رکھے، تو اس کا مطلب ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ وضاحت سے کس طرح سوچے اور کس طرح اپنے افکار کو منظّم کرے، اس لیے پھر وہ نازیبا طریقے اور ناروا سلوک کے ذریعہ دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، یا اپنے تفوق اور اپنے تسلط کے لیے یہ سب کرتا ہے، اور یہ سب کچھ وہ یہ سمجھتے ہوئے کرتا ہے کہ اس طرح اس کی پریشاں خاطری کو سکون ملے گا، اور معاملات بہتر ہو جائیں گے، اصل بات یہ ہے کہ اگر والدین صحیح صورت حال کا ادراک کر لیں تو پھر وہ اس مصیبت میں نہ پڑیں، کیوں کہ جس طرح کے برتاؤ اور رویہ پر وہ توجہ دیتے ہیں اس سے کبھی بھی بچہ سعادت مند نہیں ہو سکتا۔

اس مشکل صورت حال کے علاج کے لیے ضروری ہے کہ آپ غیر متوقع ردعمل کا اظہار کریں، اب تک آپ جو برتاؤ کرتے آئے ہیں اس کے بالکل برخلاف کریں، بچے کے غصے، اس کے جھگڑے اور سرکشی پر فوری طور پر کوئی تبصرہ کرنے سے گریز کریں، آپ کے لیے مثلاً یہ ممکن ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے کمرہ سے باہر نکل جائیں، یا کسی دوسرے کام میں مشغول ہو جائیں، اس طرح صورت حال پر قابو پانے، ماحول بدلنے اور رویّہ تبدیل کرنے میں بڑی آسانی ہو سکتی ہے، اس طرح بہت مختصر مدت میں آپ خود مشاہدہ کریں گے کہ محسوس طور پر تبدیلی آئے گی، صورت حال بدلے گی اور برتاؤ بہتر ہوگا۔

یہ بھی اہم بات ہے کہ ہم مثبت اور بہتر برتاؤ پر توجہ دیں، اس پر اس کی حوصلہ افزائی کریں، اس کی رعایت کریں، اس کو وقت دیں تاکہ اس طرح تمام کام بآسانی انجام پاتے رہیں۔

عام طور پر بڑوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چھوٹوں کے ساتھ غیر مجرب طرز اپناتے ہیں، یوں ہی روایتی طور پر بغیر کچھ سیکھے ہوئے ان کے ساتھ برتاؤ کرتے ہیں، بغیر سوچے سمجھے ردعمل کا اظہار کرتے ہیں، یہ بھی صحیح ہے کہ جس طرح کے برتاؤ کے لوگ عادی ہوتے ہیں، اس کو تبدیل کرنا آسان نہیں، اس لیے ہم اس کو بہت سہولت و تدریج کے ساتھ تبدیل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں، وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ تبدیلی کی اس کوکوشش کے آثار خود ہی نظر آئیں گے۔

اچھی صحت کے لیے ماحول کے تحفظ اور صحیح نشو نما نیز بچوں

سے اچھے تعلقات استوار رکھنے کے چار بنیادی اصول ہیں:

۱۔ ایک دوسرے کا احترام، ہر ایک کی خصوصیات پر توجہ اور ضروریات کا خیال۔

۲۔ اچھے برتاؤ اور مثبت سلوک کی حوصلہ افزائی۔

۳۔ اولاد کے ساتھ گذارنے کے لیے کچھ وقت خاص کرنا، جس میں ان کے ساتھ کچھ ہنسی تفریح، کھیل کود اور اٹھکھیلیوں کا سامان ہو، اس طرح کی ہلکی پھلکی چیزیں (activitiese) گھریلو گشیدگی کو ختم کرنے میں بہت معاون ہوتی ہیں، آپسی تعاون اور ایک دوسرے کے ساتھ شرکت کے جذبہ کو فروغ دیتی ہیں۔

۴۔ افراد خانہ کے درمیان مشترک محبت کا اظہار ضروری ہے، والدین بچوں کو یہ احساس دلائیں کہ وہ ان کی زندگی میں بہت اہم ہیں، وہ ان کی سعادت و نیک بختی کے بے حد خواہاں ہیں۔

ایسی کئی تحقیقات (Researches) ہیں جو اس کی وضاحت کرتی ہیں، کہ اگر میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے سے محبت کرنے والے ہیں، تو ان کے زیر تربیت اولادوں کو صحیح اور فطری نشو نما کا بہت اچھا موقع ملتا ہے، برخلاف ایسے ماحول کے جس میں ماں باپ خود ہی ایک دوسرے سے کراہیت اور عدم یکسانیت کے ساتھ جیتے ہوں۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ ماں عام طور پر پورا دن گھر ہی میں بچوں کے ساتھ رہتی ہے، اس کے لیے نہایت ضروری ہے کہ وہ اپنے لیے کچھ وقت مخصوص کرے خواہ وہ آدھے گھنٹہ کا وقت ہی کیوں نہ ہو، اس خاص وقت میں وہ بچوں کے شور شرابہ سے دور سکون کے ساتھ آرام کرے، یہ آرام کا وقت صرف ماں کے لیے ہی اہم اور ضروری نہیں، بلکہ اس میں بچوں کے لیے بھی مصلحت پوشیدہ ہے، بایں طور کہ ماں کو اس آرام کے بعد ایک نیا نشاط حاصل ہوگا، اسے ایک نئی طاقت ملے گی اور پھر زیادہ اچھے طریقہ سے ان بچوں کی دیکھ ریکھ کرے گی اور کاموں کو انجام دے سکے گی۔

اس کے ساتھ ہم کو ماں باپ کے ایک ساتھ وقت گزارنے کی اہمیت کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ انھیں بھی بچوں کے ساتھ خاص اوقات کے علاوہ کوئی وقت اپنے لیے بھی فارغ کرنا چاہیے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ مار پیٹ اور تذلیل وتحقیر نیز بالادستی حاصل کرنے اور قابو پانے کے لیے ہر قسم کی سختی سے معاملہ ہمیشہ مزید سنگین ہوگا، اور برائی مزید بڑھے گی، سرکشی اور انتقام کی نفسیات پیدا ہوں گی، اس طرح والدین ہمیشہ اپنی اولاد کے ساتھ کشمکش میں مبتلا رہیں گے۔

بعض اوقات نامناسب برتاؤ اور ناروا سلوک کو نظر انداز کرنے کی کوشش کے نتائج سے آپ بالکل مت گھبرائیے، کیوں کہ بسا اوقات آپ بچے کے اس طرح کے برتاؤ پر متوجہ ہوکر اسے مزید اس طرح کا رویہ اپنانے پر حوصلہ افزائی کرتے ہیں، اگر آپ بعض وقت اس کے منحرف سلوک سے چشم پوشی برتیں گے تو اس سے آپ کی موافقت نہیں سمجھی جائے گی، بلکہ یہ ایک حکیمانہ طریقہ ہوگا، جس کے نتیجہ میں آپ مناسب ماحول میں مناسب علاج کرسکیں گے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ انسانیت کا مستقبل خاندان کے مستقبل کا مرہون منت ہے، خاندان کی اصلاح کے بغیر نہ معاشرہ کی اصلاح ممکن ہے اور نہ امت کی، اسی سے ان تربیتی اصولوں اور افکار وعملی اقدامات کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے جو والدین کو بچوں کے ساتھ اپنے برتاؤ میں قدرے تبدیلی کے لیے مہمیز کرتے ہیں، بڑے بڑے امور اسی طرح کے معمولی اقدامات کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں، یا یوں کہیے کہ چھوٹے چھوٹے کام عظیم الشان امور کا پیش خیمہ ہوتے ہیں، حدیث نبوی ہے کہ "احب الأعمال إلى الله أدومها وإن قل" کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ عمل وہ ہے جو ہمیشہ انجام دیا جائے، خواہ وہ بہت تھوڑا ہو۔

پہلا جدول (جھگڑے سے گریز کیجئے)

برتاؤ	برتاؤ کے تئیں والدین کا نظریہ	والدین کی شرکت	جھگڑے سے گریز کیجئے
بچوں کے درمیان ہمیشہ جھگڑا ہونا اور پھر کسی ایک کا روتے ہوئے آنا اور اپنی ماں کی توجہ حاصل کرنا	بچہ توجہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اور والدین اس سے پریشانی محسوس کرتے ہیں	ماں بچے کے اس برتاؤ پر اس کی اس طرح حوصلہ افزائی کرتی ہے کہ اس نے جو توجہ چاہا وہ فوراً اسے حاصل ہوگئی، وہ فوراً ان کے جھگڑے میں مداخلت کر کے اس کے حل کی کوشش کرتی ہے، لیکن بچہ یہ رویہ بار بار دوہراتا ہے جس سے ماں کے طریقہ کار کا غیر موثر اور بہتر نہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔	بچوں کے آپسی جھگڑے میں مداخلت نہ کیجئے الا یہ کہ کوئی بہت ہی سنگین معاملہ ہو، اگر وہ اس طرح کے منفی رویہ کے ذریعہ توجہ طلب کریں تو بالکل توجہ مت دیجئے، البتہ ان پر توجہ دینے کے لیے کچھ وقت خاص کیجئے جو ان کے ساتھ گذارا جائے اور انھیں احساس دلایا جائے کہ والدین ان پر توجہ دیتے ہیں۔
مثلاً گیارہ سالہ بچہ کھانے کے بعد اپنی پلیٹ باورچی خانہ میں لے جا کر رکھنے سے انکار کرتا ہے، اسی طرح وہ برتنوں کے دھونے میں مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔	یہاں بچہ بالا دستی کو ثابت کرنے کے لیے ایک کشمکش یا ایک طرح کے ردو کد میں داخل ہوجاتا ہے، والدین اس موقع پر غصہ کا اظہار کرتے ہیں۔	ایسے موقع پر فوراً باپ مداخلت کرتا ہے اور ایک لکچر دے ڈالتا ہے، بچے پر پلیٹ اٹھا کر لے جانے کے لیے دباؤ بناتا ہے، بچہ میں اس سے انتقام کی نفسیات پیدا ہوتی ہے اور وہ فوراً ہی والد سے انتقام کا پلان بنانے میں لگ جاتا ہے۔	زیادہ موثر طریقہ یہ ہے کہ تفوق وقدرت اور بالا دستی کے لیے کوئی بکھیڑا نہ کھڑا کیا جائے، ایسے موقع پر پیچھے ہٹ جانا اور نظر انداز کرنا عقلمندی ہے، بعد میں سکون سے اس موضوع پر گفتگو کرنا چاہیے۔
مثلاً ۱۵ سال کی بچی دو ہفتہ کے لیے اپنی والدہ سے بات نہ کرنے کے عزم کا اظہار کرتی ہے۔	بچہ انتقامی کارروائی کرتا ہے، والدین ایسے انتقامی اقدام سے پریشانی اور تکلیف محسوس کرتے ہیں۔	ماں کا غصہ بھڑک جاتا ہے، وہ صبر کا دامن چھوڑ دیتی ہے، اور بات نہ کرنے کے نتائج سے دھمکاتی ہے، اس طرح بچی کی خاموشی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، اور اس کے گفتگو نہ کرنے کے عزم میں اور پختگی آتی ہے۔	ماں باپ سے بچوں کے تعلق ومحبت کا امتحان لینا بالکل سودمند نہیں ہوگا، جب حالات نارمل ہوں گے اور ماحول خوشگوار ہوگا تو یہ بات خود بخود آپ پر واضح ہوجائے گی۔
عدنان اپنے کام کاج کرنے میں بہت سست ہے، اس کے پاس دوست احباب بھی نہیں ہیں۔	اگر بچہ بحسن وخوبی اپنے کام نہیں انجام دے پاتا تو عام طور پر والدین مایوسی اور عجز محسوس کرتے ہیں۔	ایسے موقع پر عام طور سے والدین یا بچے کو ہٹا دیتے ہیں، جھڑک دیتے ہیں، یا اس پر عتاب کرتے ہیں، بسا اوقات اس سے ناامید ہوجاتے ہیں، اور اگر ذرا شفقت کا اظہار کرتے ہیں تو خود اس کے کام انجام دے دیتے ہیں، اس طرح نہ وہ آگے بڑھ پاتا ہے، اور نہ ہی اس میں اچھے طریقہ سے کام کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔	نہ محض تنقید سے کچھ حاصل ہوگا اور نہ ہی محض شفقت سے، بلکہ اس کو کوشش کرنے پر آمادہ کرنا اور ابھارنا ہی مفید ہوگا، اس سے وہ آگے بڑھے گا، حوصلہ افزائی بڑے بڑے عجائب کے وجود میں آنے کا سبب بن جاتی ہے۔
۱۳ سالہ حسان نے پڑھائی میں دلچسپی لینا چھوڑ دیا، دیر تر گھر سے باہر رہنے لگا۔	بچہ دوستوں کی توجہ چاہتا ہے، ان سے تعریف و توصیف کا خواہاں ہوتا ہے، والدین اس سے پریشانی محسوس کرتے ہیں، اور ان کو لگتا ہے کہ بچہ نامناسب طور پر مشغول ہوگیا ہے۔	والدین غصہ ہوتے ہیں، جھگڑتے ہیں، بچے کو دھمکاتے ہیں، جس سے گھر کا ماحول میں تناؤ پیدا ہوتا ہے، پھر گھر کا ماحول ایسا ناخوشگوار ہوتا ہے جس میں کسی کو سکون نہیں ملتا۔	بچے پر اور اس کے دوستوں پر توجہ دیجئے، انھیں اہمیت دیجئے، اس کے ساتھ بات چیت کے لیے کچھ وقت خاص کیجئے، اور یاد رکھیے کہ عمل گفتگو سے زیادہ بہتر ہے۔

□ انکار حدیث

امام ابوحنیفہ اوران کے اجتہادی اصول (قسط-۱)

تحریر: ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی مرحوم
تلخیص وترجمانی: محمد فرید حبیب ندوی

نسب اور عمر :

ابوحنیفۃ نعمان بن ثابت بن زوطی ائمہ اربعہ میں سے پہلے آپ ہی پیدا ہوئے ،سب سے زیادہ مقلدین بھی آپ ہی کے ہیں۔کوفہ میں ۶۳ یا ۷۰ یا مشہور قول کے مطابق ۸۰ھ میں پیدا ہوئے ،بعض حضرات نے تاریخ ولادت کے بارے میں دوسرے قول کو ترجیح دی ہے (ابن حبان انہی میں سے ہیں۔(مزید تفصیل کے لیے تانیب الخطیب دیکھئے)۱۵۰ھ میں بغداد میں وفات ہوئی ،بغداد میں آپ کے نام سے ایک محلّہ اعظمیہ کے نام سے ہے، وہیں آپ کا مزار ہے جو زیارت گاہ خلائق ہے۔

نشوونما :

اس زمانہ میں کوفہ بڑے اسلامی شہروں میں سے تھا ، ہر جماعت کے علماء سے بھرا ہوا تھا ،نحو وصرف اور ادب ولغت کے ائمہ اس میں سب سے زیادہ تھے ، پہلے آپ نے علم کلام میں مہارت حاصل کی ، اور اس علم میں مرجعیت حاصل کر لی ، پھر کوفہ کے شیخ الفقہاء حماد کے حلقہ سے وابستہ ہوگئے ، اس حلقہ کا سر دستہ حضرت عبد اللہ بن مسعود سے جاملتا ہے ، کہ حضرت حماد نے حضرت ابراہیم نخعی سے اور نخعی نے علقمہ بن قیس سے اور علقمہ سے حضرت ابن مسعود سے علم حاصل کیا تھا، آپ حضرت حماد کی وفات (۱۲۰ھ) تک انہی سے وابستہ رہے ، حماد کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے آپ کو استاد کا جانشین بنالیا، اس طرح کوفہ کے مدرسہ کی صدر نشینی آپ کے حصہ میں آئی ، اس مدرسہ ومکتبہ کو ''مدرسۃ الرائی'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔آپ بلا اختلاف کوفہ کے امام بن گئے ،آپ کی شہرت بام عروج کو پہنچ گئی ، آپ نے بصرہ،کوفہ، مدینہ اور بغداد کے مشاہیر علماء سے ملاقات کی، استفادہ بھی کیا اور افادہ بھی، آپ کی شہرت اس حد تک پہنچ گئی کہ آپ کے حلقہ میں ایک طرف کبار محدثین جیسے ابن مبارک اور حفص بن غیاث اور کبار فقہاء جیسے ابو یوسف، محمد شیبانی، حسن بن زیاد اور زفر، اور دوسری طرف فضیل بن عیاض اور داؤد الطائی جیسے درویش وبزرگ حضرات شامل تھے۔آپ نے پوری زندگی علمی امانت ادا کرنے، عبادت میں مشقت اٹھانے ، معاملات میں استقامت، زہد فی الدنیا اور اللہ ورسول اور مسلمانوں کے لیے خیر خواہی میں گزری۔

آپ کے مسلک کے اصول:

بیہقی نے یحیی بن خریس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سفیان کے پاس ایک شخص آیا، اس وقت میں وہاں موجود تھا، اس نے کہا کہ اے سفیان! آپ ابوحنیفہ پر تنقید کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے کہا کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے ابوحنیفہ کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ میں پہلے کتاب اللہ سے لیتا ہوں، نہ ملے تو سنت رسول اللہ سے، اس کے بعد صحابہ کے اقوال سے، ان میں سے جس کے قول کو چاہتا ہوں اختیار کرتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں چھوڑ دیتا ہوں، لیکن ان کے قول سے باہر نہیں جاتا، اور جب بات ابراہیم نخعی، شعبی، ابن سیرین، حسن، عطا، اور ابن مسیّب (اور بھی کچھ لوگوں کے نام لیے) تک جا پہنچتی ہے تو جس طرح انہوں نے اجتہاد کیا میں بھی اجتہاد کرتا ہوں۔

قرآن وحدیث اور اقوال صحابہ کی عدم موجودگی میں آپ قیاس کی طرف رجوع کرتے، قیاس کی ایک قسم آپ کے یہاں استحسان کے نام سے پائی جاتی ہے جسے قیاس خفی کہا جاتا ہے۔

آپ کے خلاف فساد انگیزیزی:

آپ کے یہ اصول بالکل وہی اصول ہیں جو دیگر ائمہ خاص کر ائمۂ ثلاثہ کے ہیں، آپ کی خدمات اور جلالت شان کو دیکھتے ہوئے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سارے مسلمان آپ کی عظمت وجلالت پر متفق ہوتے مگر آپ کی زندگی میں بھی اور آپ کی وفات کے بعد بھی آپ کے بارے میں بڑا ہنگامہ کیا گیا، بہت سوں نے آپ پر طعن وتشنیع کے تیر بھی برسائے۔

اس فساد وشر انگیزی کے اسباب:

۱۔ امام صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس استنباط فقہ میں اتنی وسعت اختیار کی، اور اصول سے فروع در فروع نکالتے رہے، اور فرضی مسائل وواقعات کے بھی جوابات بیان کیے، جبکہ علماء اسے ناپسند کرتے تھے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے جب کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو سوال فرماتے کہ کیا یہ پیش آچکا ہے، اگر جواب نفی میں ملتا تو کہتے کہ اسے چھوڑے رکھو اس وقت کے لیے جب یہ پیش آئے گا۔

لیکن امام صاحب کا خیال تھا کہ ایک فقیہ ومجتہد کو چاہیے کہ مسائل کے پیش آنے سے پہلے وہ جواب تیار رکھے۔

خطیب بغدادی نے آپ کے اس نقطۂ نظر کی وضاحت اس طرح کی ہے:

''حضرت قتادہ کوفہ آئے تو امام ابوحنیفہ نے ان سے پوچھا کہ اے ابوخطاب! اس سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے کہ: ''ایک شوہر اپنی بیوی سے کئی سال تک دور رہا، اس کی بیوی نے سمجھا کہ شاید مر چکا ہے، اور دوسرے شوہر سے شادی کر لی، پھر پہلا شوہر واپس آگیا تو اس عورت کے مہر کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے، یہ سوال کرنے سے پہلے امام صاحب اپنے شاگردوں سے کہہ چکے تھے کہ اگر یہ (قتادہ) اس سلسلہ میں کوئی حدیث پیش کریں گے تو جھوٹی ہوگی اور اگر اپنی رائے سے جواب دیں گے تو غلطی کریں گے) قتادہ نے کہا: کیا یہ مسئلہ پیش آچکا ہے؟ آپ نے کہا نہیں، تو انھوں نے کہا کہ جو مسئلہ پیش نہیں آیا اس کے بارے میں آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہم مصیبت کے نازل ہونے سے پہلے مصیبت سے نمٹنے کی تیاری کر کے رکھتے ہیں۔

امام صاحب کا مکتب فکر ''أرأیتین'' (یعنی أرأیت لو کان کذا) کے نام سے مشہور ہوا، ایک مرتبہ امام مالک سے ان کے کسی شاگرد نے کچھ پوچھا، آپ نے جواب دیا، اس نے کہا ارأیت لوکان کذا؟ یہ سن کر آپ ناراض ہوئے اور کہا کہ کیا تم ارأیتین میں سے ہو؟ کیا تم عراق سے آئے ہو؟

ابن عبدالبر نے ہی نقل کیا ہے کہ عبدالملک بن مروان نے ابن شہاب زہری سے کچھ پوچھا تو ابن شہاب نے کہا: امیر المؤمنین! کیا یہ چیز پیش آچکی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، تو آپ نے فرمایا: اسے چھوڑے رکھئے جب ایسا ہوگا تو اللہ تعالی خود کشادگی پیدا فرمادے گا۔

ابن عبدالبر نے اپنی سند سے ہی امام شعبی کا جو کہ عراق کے ائمہ حدیث میں سے ہیں یہ قول نقل کیا ہے، ان لوگوں کی وجہ سے میرا مسجد میں آنے کا جی نہیں چاہتا، یہ مسجد مجھے اب میرے گھر کے کوڑے دان سے زیادہ مبغوض ہوگئی ہے، میں نے پوچھا: اے ابوعمرو: یہ کون لوگ ہیں؟ کہا ارائیون، کہتے ہیں کہ ان میں سے حکم اور حماد اور ان کے اصحاب ہیں، اور یہ حماد امام ابوحنیفہ کے شیخ ہیں۔

شعبی سے روایت کیا ہے کہ ''أرأیت سے زیادہ مجھے کوئی اور مبغوض نہیں''۔

امام نے استنباط اور تفریع میں اتنی وسعت پیدا کی کہ صاحب عنایہ کے بقول آپ نے جو مسائل مستنبط کیے ان کی تعداد ۱۲/ لاکھ ستر ہزار کے قریب ہے، اگر اس مقدار کو مبالغہ پر محمول کیا جائے تب بھی آپ کے مستنبط کردہ مسائل دیگر اماموں سے کہیں زیادہ ہیں، آپ کی تفریع مسائل میں کثرت کی وجہ سے بعض ناقدین نے یہاں تک کہہ دیا کہ ابوحنیفہ اس کو تو سب سے زیادہ

جانتے ہیں جو ابھی پیش نہیں آیا ہے اور جو پیش آچکا ہے اس کے بارے میں سب سے بڑے جاہل ہیں۔

۲۔ امام صاحب حدیث قبول کرنے میں بڑے متشدد تھے ،آپ کے شرائط محدثین کی شرائط سے بھی کڑے تھے،اس کی وجہ یہ تھی کہ عراق وضع حدیث کا مرکز بن چکا تھا ، آپ نے احتیاطاً کڑے شرائط لگائے ، جس کی وجہ سے بہت سی وہ حدیثیں جو محدثین کے نزدیک صحیح تھیں آپ کے نزدیک ضعیف قرار پائیں۔

۳۔ آپ ثقہ راوی کی مرسل قبول کرلیا کرتے تھے،جس کی وجہ سے بہت سی وہ احادیث جو محدثین کے نزدیک ضعیف تھیں،آپ نے ان سے استدلال کیا۔

۴۔ حدیث قبول کرنے کے تحت شرائط کے لگانے کے بعد عمل بالحدیث کا دائرہ تنگ ہوگیا اور قیاس اور رائے استعمال کرنے کا دروازہ وسیع ہوگیا، اور اس سلسلہ میں اللہ تعالی نے آپ کو بے نظیر صلاحیتوں سے نوازا تھا۔

۵۔ امام صاحب استنباط کے موقع پر ایسی ایسی باریکیاں نکالتے تھے جو دوسروں کے بس کا روگ نہیں، اور جسے دیکھ کر بڑی حیرانی ہوتی۔

ابن ابی العوام نے اپنی سند سے امام محمد سے نقل کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ بغداد آئے تو آپ کے اصحاب نے جن میں ابو یوسف، زفر، اسد بن عمرو، اور دوسرے فقہاء تھے ایک مسئلہ تیار کیا اور اسے دلائل سے مزین کیا پھر امام صاحب کے سامنے رکھا امام صاحب نے ان کے جواب سے الگ جواب دیا، وہ لوگ چیخنے لگے۔ امام صاحب نے خاموش کیا اور پھر ان کے جو دلائل تھے انہیں رد کر کے اپنے دلائل پیش کیے، حتی کہ انہوں نے آپ کے قول کو تسلیم کرلیا، پھر آپ نے کہا کہ تمہارا قول صحیح تھا اور یہ قول غلط ہے، انہوں نے کہا کہ آپ نے ہم پر ظلم کیا جبکہ ہم صحیح تھے، آپ نے فرمایا یہ دونوں قول غلط ہیں، تیسرا ایک قول اور ہے وہی صحیح ہے، کہنے لگے ہو ہی نہیں سکتا، آپ نے دلائل سے اسے بھی ثابت کردیا، پھر وہ کہنے لگے کہ ابو حنیفہ آپ ہمیں صحیح صحیح بتایئے، آپ نے فرمایا کہ پہلا قول ہی درست وصحیح تھا اور اس کے دلائل بھی دیئے ، اور پھر کہا کہ اس مسئلہ میں یہی تین پہلو ممکن تھے، ہر ایک کی دلیل ہے لیکن صحیح وہی ہے لہذا اس کو اختیار کرو۔

جسے ایک مسئلہ کی مختلف آراء کو اس طرح الٹنے پلٹنے اور ہر ایک کا دفاع کرنے کی عجیب وغریب قدرت حاصل ہو وہ یقیناً لوگوں میں بہت وسیع النظر، دوررس اور باریک بیں ہوگا، نصوص سے استنباط کرنے میں بہت گہرائی تک جانے والا ہوگا، دلیل اور حجت کے اعتبار سے قوی تر ہوگا، امام مالک نے جو کچھ آپ کی شان میں کہا تھا شاید وہ مبالغہ نہیں کہ اگر یہ شخص اس ستون کو سونے کا ثابت کرنا چاہے تو دلائل سے ثابت کرسکتا ہے۔

آپ کی ایسی باریک بینی کو دیکھ کر اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ آپ جمہوری رائے کی مخالف کریں، اور ان جمہور محدثین سے الگ رائے قائم کریں جو اکثر نصوص کے ظواہر تک محدود رہتے ہیں، حتی کہ کچھ ایسے عوام محدثین بھی گزرے ہیں جیسا کہ یحیی بن یمان نے کہا ہے کہ کچھ ایسے سیدھے سادے محدثین بھی گزرے جن کی سادگی اور امّیت نے ان سے بڑی مضحکہ خیز غلطیاں کرائیں، ایک صاحب کے بارے میں ہے کہ بغیر وضو کیے استنجا کے بعد انہوں نے وتر نماز پڑھی، اور دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کی کہ؟؟؟؟ فلیوتر جبکہ اس سے مراد یہ ہے کہ استنجاء کے موقع پر طاق عدد میں ڈھیلا لینا چاہیے۔

ایک صاحب چالیس سال تک جمعہ کی نماز سے قبل بال مونڈنے کو ناجائز سمجھتے رہے، "نهى رسول الله عن الحلق قبل صلاة الجمعة" کی وجہ سے، جب کہ اس سے حلقے بنا کر بیٹھنے کی ممانعت مراد ہے، اور بکسر الحا اور بفتح اللام ہے۔ ایک صاحب نے "نهى أن يسقى الرجل ماء ه زرع غيره" سے پڑوسیوں کے باغ کی سینچائی کی ممانعت مراد لی، جبکہ اس سے مراد قیدی حاملہ عورتوں سے وطی کی ممانعت مقصود ہے، ایک صاحب سے پوچھا گیا کہ اگر مرغی کنویں میں گر جائے تو کیا کیا جائے؟ کہنے لگے اسے ڈھکتے کیوں نہیں تاکہ اس میں کچھ نہ گرے، ایک صاحب سے فرائض کا

کوئی مسئلہ پوچھا گیا تو جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ کے فرائض کے مطابق تقسیم کیا جائے گا۔

اس طرح کے عام محدثین امام صاحب کی دقیقہ رسی کو کیسے سمجھتے، سب سے زیادہ بدگمانی اور غلط فہمی انہی حضرات نے پیدا کی۔

۶۔ تنافس انسان کی فطرت ہے، بہت کم انسان اس سے بچ پاتے ہیں، ابن عبدالبر نے ''جامع بیان العلم'' میں ایک خاص فصل علماء کے تنافس کے نام سے قائم کی ہے، جس کے شروع میں اولاً حضرت ابن عباس رضی اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ علماء سے علم حاصل کرو، اور ایک دوسرے کے خلاف ایک دوسرے کی تصدیق نہ کرو، اس کے بعد ابن عبدالبر نے محمد بن اسحاق کے بارے میں امام مالک کا، امام شافعی کے بارے میں یحیی بن معین کا اور اہل مکہ کے بارے میں حماد اور زہری کا قول نقل کیا ہے۔

امام صاحب بھی شہرت وعظمت کی چوٹی کو چھو رہے تھے، جس کی وجہ سے علماء کے دلوں میں تنافس پیدا ہونا فطری تھا، یہاں تک کہ مجلسوں میں آپ کی شان میں وہ باتیں کہی جاتیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ،اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں امام صاحب نے کہا تھا کہ ''ابن ابی لیلی میرے بارے میں ایسی بات کو بھی حلال سمجھتے ہیں جو میں کسی جانور کے بارے میں بھی حلال نہیں سمجھتا''۔

۷۔ ان تمام عوامل کا اثر لازمایہ پڑتا کہ آپ کے بارے میں غلط سلط باتیں مشہور ہوجاتیں، چنانچہ ایسا ہوا بھی، آپ نے بہت سے علماء کے اقوال کی مخالفت کی، ان لوگوں کے پاس بھی احادیث کے دلائل تھے جس کی وجہ سے وہ امام صاحب کو غلط سمجھتے تھے لیکن وہ جب امام صاحب کی باریک بینی اور دقیقہ رسی کو دیکھتے تو آپ کی تعریف کرنے لگتے، ''الخیرات الحسان'' کے مصنف نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ امام اوزاعی امام ابوحنیفہ کی شہرت کے ابتدائی زمانہ میں آپ کے بارے میں غلط گمان رکھتے تھے، ابھی تک آپ سے ملاقات بھی نہیں ہوئی تھی، اسی دوران ایک مرتبہ امام اوزاعی نے عبداللہ بن مبارک سے پوچھا کہ یہ کون بدعتی ہے جو کوفہ سے نکلا ہے جس کی کنیت ابوحنیفہ ہے، عبداللہ بن مبارک نے کچھ جواب نہ دیا، بلکہ کچھ دقیق ومشکل مسائل ذکر کرنے لگے اور ان کو سمجھنے اور ان کے بارے میں فتوی بیان کرنے لگے، امام اوزاعی نے پوچھا کہ یہ فتاوی کس شخص کے ہیں؟ کہا: ایک شیخ کے جن سے میں نے عراق میں ملاقات کی تھی، اوزاعی نے کہا کہ یہ تو کوئی عظیم شیخ ہیں، ان کے پاس جاؤ اور خوب علم حاصل کرو، پھر ابن مبارک نے بتایا کہ یہ ابوحنیفہ ہیں.....اس کے بعد امام اوزاعی کی امام صاحب سے ملاقات ہوئی تو اوزاعی نے ان مسائل کے سلسلے میں جو ابن مبارک نے ذکر کیے تھے مذاکرہ کیا، امام صاحب نے ان کو کھول کھول کر بیان کیا، جب دونوں جدا ہوئے تو اوزاعی نے ابن مبارک سے کہا کہ اس شخص کے وفور علم اور اس کی بلا کی ذہانت پر مجھے رشک آتا ہے، میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہوں، میں غلطی پر تھا، تم اس شخص کو لازم پکڑلو، یہ تو اس کے بالکل برخلاف نکلے جو ان کے بارے میں مجھے خبر پہنچی تھی۔

امام ابو حنیفہ کے بارے میں امام مالک وعلماء کے اقوال : امام صاحب کے زمانہ کے کبار علماء سے امام صاحب کے بارے میں متناقض اقوال منقول ہیں، اس کا اندازہ خطیب بغدادی کی تاریخ سے ہوسکتا ہے کہ آپ کی تعریف اور مذمت دونوں میں علماء کے اقوال نقل کیے ہیں، اگرچہ ہماری رائے بھی وہی ہے جو عیسی بن ابوبکر الایوبی کی ہے کہ امام صاحب کے مذمت وطعن میں وارد روایات جھوٹی ہیں، مگر اسے بھی ہم بعید نہیں سمجھتے کہ مذکورہ اسباب جن کی ایک مثال امام اوزاعی کے قصہ میں گزر چکی ہے کی وجہ سے ان روایات میں سے کچھ صحیح بھی ہوں، لیکن جن حضرات سے طعن منقول ہے، امام ابو حنیفہ کے مختلف اسفار خاص کر حج کے پچپن اسفار کے بعد جب ان علماء کی آپ سے ملاقات ہوئی تو حقیقت کا انہیں پتہ چلا اور پھر انھوں نے بجائے آپ کی مذمت کے آپ کی تعریف وتوصیف کی، اسی وجہ سے بعد میں آپ کے تفقہ اور قوت دلالت وحجت کی گواہی علماء نے تواتر کے ساتھ دی ہے۔

قاضی عیاض نے ''المدارک'' میں نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ مدینہ میں امام مالک کی امام ابوحنیفہ سے ملاقات ہوئی، ملاقات کے بعد جب مالک باہر آئے تو پسینہ میں شرابور تھے، لیث بن سعد نے پوچھا کہ کیا بات پسینہ کیوں آرہا ہے؟ کہنے لگے کہ ابوحنیفہ تو بہت عظیم فقیہ ہیں۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ امام صاحب کے شاگردوں نے آپ کے جو اقوال مدون کرائے تھے امام مالک ان کا مطالعہ کرتے تھے حتی کہ آپ کے بیان کردہ تقریباً ساٹھ ہزار مسائل انھوں نے جمع کر لیے تھے، یہ بات امام مالک کے حوالہ سے ابن ابی العوام سعدی اور ابوعبداللہ بن علی صمیری نے نقل کی ہے۔

امام ابوحنیفہ کی شان میں امام مالک کی مذمت کے جو اقوال منقول ہیں مالکیہ نے ان کے بہت سے جواب دیئے ہیں اور سب نے اعتراف کیا ہے کہ امام مالک امام ابوحنیفہ کے ثناخواں تھے۔ ابوجعفر الدودی ''النامی علی المؤطا'' کے مصنف نے امام مالک کی طرف سے عذر بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ امام مالک نے یہ غصہ کی حالت میں کہا ہوگا۔

ابن عبدالبر کی رائے ہے کہ امام صاحب کے بارے میں امام مالک کی زبان سے جو طعن کی روایات منقول ہیں وہ امام مالک کے محدثین تلامذہ کے واسطے سے ہیں، لیکن امام مالک کے فقہاء تلامذہ ان میں سے کسی کو بھی درست نہیں مانتے۔

ابوالولید الباجی نے مؤطا کی شرح میں امام مالک کی طرف ان تمام اقوال کی نسبت ہی کو غلط بتایا ہے اور لکھا ہے کہ امام مالک نے فقہاء کے بارے میں کبھی کلام کیا ہی نہیں۔ صرف بعض رواۃ کے ضبط کے بارے میں کلام کیا ہے، اس کی یہ دلیل دی ہے کہ امام مالک عبداللہ بن مبارک کا بہت احترام کرتے تھے حالانکہ ابن مبارک امام ابوحنیفہ کے اخص الخاص تلامذہ میں سے ہیں۔

امام صاحب کی مذمت میں امام شافعی کے جو اقوال منقول ہیں ان کے جھوٹا ہونے میں تو کوئی شک ہی نہیں، کیوں کہ امام شافعی نے تو امام ابوحنیفہ کا زمانہ ہی نہیں پایا، اور آپ کے تلامذہ خصوصا امام محمد سے استفادہ کیا اور ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر علم حاصل کیا، لہذا یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی کہ آپ امام کا تذکرہ مذمت کے ساتھ کرتے ہوں گے جبکہ آپ کا یہ جملہ بڑا مشہور ہے کہ: ''لوگ فقہ میں ابوحنیفہ کے محتاج ہیں''۔

امام احمد نے بھی آپ کا دور نہیں پایا، بلکہ آپ کے شاگرد امام ابویوسف سے خود ان کے بقول استفادہ کیا اور آپ نے امام محمد کی کتابوں کا مطالعہ کیا، کسی آپ سے پوچھا کہ یہ دقیق جوابات آپ نے کہاں سے لیے؟ کہا کہ محمد بن حسن کی کتابوں سے۔

ہاں اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ امام احمد سے امام صاحب کے مسلک کے بارے میں کچھ منقول ہو، کیونکہ حدیث کے استدلال کرنے کے باوجود دونوں میں اختلاف تھا کہ امام احمد ضعیف حدیث کو لوگوں کی رائے پر ترجیح دیتے تھے جبکہ امام صاحب صرف صحیح حدیث ہی کو قبول کرتے تھے، اور ضعیف کے مقابلہ میں رائے کو ترجیح دیتے تھے، اور اس طرح کے اختلاف کو طعن نہیں سمجھا جاسکتا۔

اس فتنہ انگیزی کے نتائج:

ان اسباب کی وجہ سے امام صاحب کے خلاف جو طوفان کھڑا کیا گیا اس کی وجہ سے آپ کی طرف سے ایسے عقائد و اعمال منسوب کر دیے گئے، جن سے آپ کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، بعض نے آپ کو قدری بتایا، کسی نے مرجیہ میں سے بتایا، کسی نے کہا کہ آپ تناسخ کے قائل تھے، اور کسی نے کہا کہ منکر حدیث تھے، اور بہت سوں نے کہا کہ آپ اللہ کے دین میں اپنی رائے اور خواہش کا استعمال کرتے تھے۔

امام صاحب کی وفات اور آپ کے مکتب فقہ کے پھیلنے کے بعد یہ تمام الزامات ھباءً منثورا ہو گئے مگر دو الزام آج بھی آپ پر لگائے جاتے ہیں، ایک تو یہ کہ آپ حدیث میں بہت قلیل البضاعہ تھے، اور دوسرا یہ کہ آپ حدیث صحیح کے مقابلہ میں قیاس اور رائے کو ترجیح دیتے تھے۔

۱۔ کیا ابو حنیفہ حدیث میں قلیل البضاعہ تھے؟ خطیب بغدادی نے بہت سے اقوال نقل

کیے ہیں کہ امام صاحب قلیل البضاعہ فی الحدیث تھے، جیسے عبداللہ بن مبارک کا یہ قول کہ ابوحنیفہ حدیث کے معاملے میں تو یتیم ہیں، یحیی بن قطان نے کہا کہ آپ حدیث والے نہیں تھے، ابن معین کا یہ قول کہ ابوحنیفہ کے پاس احادیث ہیں ہی کہاں جو تم ان سے کچھ پوچھو، احمد بن حنبل کا یہ قول کہ امام ابوحنیفہ کی نہ کوئی رائے ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس کوئی حدیث، ابوبکر بن داؤد کا یہ قول کہ ابوحنیفہ سے صرف ڈیڑھ سو حدیثیں روایت کی گئیں جن میں سے نصف میں انھوں نے غلطی کی، عبدالرزاق کا یہ قول کہ میں نے ابوحنیفہ سے صرف اس لیے روایات لیں تا کہ میرے رجال میں اضافہ ہوجائے جبکہ عبدالرزاق نے امام صاحب سے صرف بیس کے قریب احادیث لیں، اور یہ قول کہ ابوحنیفہ کو ۱۷ روایات یاد تھیں۔

یہ بڑی اہم بات ہے کہ ایک ایسا امام جس کی فقہ سب سے زیادہ پھیلی اور جس کے مقلدین کروڑوں کی تعداد میں ہیں مگر اس کے پاس صرف ڈیڑھ سو یا اس سے بھی کم سولہ سترہ حدیثیں تھیں، کیا یہ صحیح ہوسکتا ہے؟

۱۔ موافقین ومخالفین سب کے نزدیک ابوحنیفہ امام ومجتہد ہیں، اور اجتہاد کی شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ احکام کی حدیثیں جو کہ ہزاروں ہیں مجتہد کے احاطہ علم میں ہو اور حنابلہ کے بقول کم از کم چند سو حدیثیں تو اس کے پاس ہوں، اب سوال یہ ہے کہ ابو حنیفہ اجتہاد کیسے کر سکتے ہیں اور کیسے ان کے اجتہاد کو ائمہ قبول کر سکتے ہیں اگر یہی شرط آپ کے اندر موجود نہ ہو؟

۲۔ ابو حنیفہ کے اجتہادات سیکڑوں مسائل میں صحیح احادیث کے موافق ہیں، مرتضی زبیدی نے ایک کتاب ''عقود الجواھر الحنفیۃ فی أدلۃ أبی حنیفۃ'' کے نام سے لکھی جس میں ایسی حدیثیں امام صاحب کے مسانید سے روایت کی ہیں جن میں آپ اور مؤلفین کتب ستہ متفق ہیں، سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر امام صاحب کے صرف چند حدیثیں یاد ہوتیں تو آپ کا اجتہاد سیکڑوں صحیح احادیث کے مطابق کیسے ہوسکتا؟

۳۔ ابن أبی شیبہ نے اپنی مصنف میں ایک خاص باب اس سلسلہ میں قائم کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے صحیح احادیث کی مخالفت کی، انہوں نے ۱۲۵ مسائل شمار کرائے ہیں جن میں امام صاحب نے صحیح حدیث کی مخالفت کی، اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ابن ابی شیبہ نے ابوحنیفہ کے تمام مسائل جمع کیے ہوں گے تو پھر سوچئے کہ ان ۱۲۵ مسائل کے علاوہ کتنے مسائل ہوں گے جن میں امام صاحب نے صحیح حدیث کی موافقت کی جبکہ اقل تعداد کے مطابق آپ کے مستنبط مسائل ۸۳ ہزار اور ایک روایت کے مطابق ۱۲ لاکھ کے قریب ہیں، اب سوال یہ ہے کہ ان سارے مسائل میں یا تو حدیث وارد ہوئی ہوگی یا نہیں، اگر ان مسائل کے سلسلہ میں حدیث وارد ہوئی ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ نکلے گا کہ حدیثیں صرف ۱۲۵ ہیں (کیوں کہ ابن ابی شیبہ کے مطابق آپ نے اتنی حدیثوں کی مخالفت کی ہے) حالانکہ محدثین اور حدیث کا علم رکھنے والوں میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں۔

۴۔ حدیث کی مصطلحات کے بارے میں ابوحنیفہ کی آرا ذکر کی جاتی ہیں، اور فن حدیث کے معتبر علماء کے نزدیک وہ معتبر ہیں، اگر امام ابوحنیفہ کو صرف چند ہی حدیثیں یاد ہوتی تو ان کی رائے کو محدثین کیوں اہمیت دیتے؟

۵۔ امام ابوحنیفہ نے چار ہزار شیوخ سے احادیث لکھی تھیں، ذہبی نے ان کو شمار بھی کرایا ہے، یحیی بن نصر سے روایت ہے کہ امام ابوحنیفہ کے کمرہ میں داخل ہوا جو کتابوں سے بھرا ہوا تھا، میں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ فرمایا، احادیث ہیں اور میں نے ان میں سے بہت کم ہی بیان کی ہیں۔

۶۔ امام ابوحنیفہ اگر چہ محدثین کی عام عادت کے مطابق تحدیث کے لیے نہیں بیٹھے اور نہ ہی آپ نے امام مالک کی طرح حدیث وآثار میں کوئی کتاب لکھی مگر آپ کے تلامذہ نے آپ کی حدیثیں الگ کتابوں اور مسانید میں جمع کیں ہیں، ان مسانید کی تعداد دس سے بھی اوپر ہے۔

ان میں سب سے مشہور ابو یوسف کی ''کتاب الآثار'' اور امام محمد کی ''کتاب الآثار المرفوعۃ'' اور ''الآثار المرفوعۃ والموقوفۃ''

ان کے علاوہ مسند الحسن بن زیاد اللؤلؤی، مسند حماد بن الإمام ابی حنیفہ ہیں، اسی طرح آپ کی مسانید میں وھبی وغیرہ نے کتابیں تصنیف کی ہیں۔

ان تما مسانید کو محمد بن محمد خوارزمی (۶۶۵ھ) نے ''جامع المسانید'' کے نام سے ایک ضخیم کتاب میں جمع کر دیا ہے، اس کتاب کو فقہی ترتیب پر مرتب کیا ہے، مکرر احادیث اور سندوں کو حذف کر دیا ہے، اس کتاب کے خطبہ میں لکھتے ہیں:

''میں نے شام میں بعض جہلاء کو امام ابو حنیفہ کی تنقیص کرتے اور آپ پر حدیث میں بے مائیگی کا الزام لگاتے سنا۔ وہ لوگ اس پر دلیلیں یہ پیش کر رہے تھے کہ'' امام شافعی کی بھی مسند ہے اور امام مالک کی بھی مؤطا ہے لیکن ابو حنیفہ کی کوئی مسند نہیں '' یہ سن کر حمیت دینی نے مجھے آمادہ کیا اور میں نے ان تمام پندرہ مسانید کو جو کبار علما نے امام صاحب کی جمع کر رکھی تھیں اس ایک کتاب میں جمع کر دیا، یہ کتاب آٹھ سو صفحات پر مشتمل ہے''۔

ان مسانید کو سماعاً اور کتابۃً جن لوگوں نے روایت کیا ان میں محدث شام ابن طولون ہیں جنہوں نے الفہرست الاوسط میں انہیں روایت کیا ہے اور مصری محدث بن یوسف صالحانی ہیں، صالحانی نے اپنی کتاب ''عقود الجمان'' میں لکھتے ہیں:

''ابو حنیفہ کبار حفاظ حدیث میں تھے، اگر حدیث پر آپ کی نظر وسیع نہ ہوتی تو مسائل فقہ میں استنباط آپ کے لیے ممکن نہ ہوتا، ذہبی نے آپ کو'' طبقات الحفاظ'' میں ذکر کیا ہے، اور آپ کا ذکر اچھے انداز میں کیا ہے''۔

عقود الجمان کے تیئسویں باب میں کہتے ہیں، آپ کے احادیث خوب یاد تھیں مگر آپ سے روایات اس لیے کم ہیں کہ آپ استنباط میں مشغول تھے، اسی سبب کی وجہ سے امام مالک اور امام شافعی سے بھی زیادہ روایات منقول نہیں ہیں، جیسے صحابہ کرام میں حضرت صدیق و حضرت عمر سے ان صحابہ کے مقابلہ میں جو آپ سے کم مرتبہ تھے بہت کم روایات منقول ہیں، باجودیکہ دونوں حضرات احادیث سے خوب واقف تھے۔

پھر اس کے بعد صالحانی نے ایسے واقعات پیش کیے ہیں جن سے ابو حنیفہؒ کے حدیث میں مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے، پھر امام ابو حنیفہ کی سترہ مسانید میں جو اسانید آئی ہیں انہیں بیان کیا ہے، اور ساتھ ہی ان مستند مسانید کے مؤلفین کا بھی تذکرہ کیا ہے، حافظ ابن طولون نے بھی ''الفہرست الاوسط'' میں ان سترہ مسانید کی اسانید بیان کی ہیں بلکہ خطیب بغدادی جب بھی دمشق کا سفر کرتے اپنے ساتھ دار قطنی کی مسند ابی حنیفہ، ابن شاہین؟؟ کی مسند ابی حنیفہ اور خود اپنی مسند ابی حنیفہ ساتھ رکھتے تھے، اور یہ تینوں مسانید اوپر ذکر کی گئی سترہ سے الگ ہیں۔

بدر عینی نے تاریخ کبیر میں لکھا ہے کہ ابن عقدہ کی مسند ابو حنیفہ ایک ہزار سے زائد حدیثوں پر مشتمل ہے، یہ مسند بھی اوپر ذکر کی گئی مسانید کے علاوہ ہے، سیوطی نے ''تعقبات'' میں ابن عقدۃ کو حفاظ حدیث میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ تمام لوگوں نے آپ کو ثقہ بتایا ہے، صرف ان لوگوں نے ضعیف کہا ہے جو متعصب تھے۔

امام زفر کی کتاب الآثار میں بھی امام صاحب سے بہت سی روایات ہیں، حاکم نے ''معرفۃ علوم الحدیث'' میں امام زفر کے حدیث میں دو اور نسخوں کا ذکر کیا ہے۔

اوپر ذکر کردہ تفصیلات سے امام صاحب کے حدیث میں کم مایہ ہونے کا جو دعوی کیا تھا اس کی غلطی واضح ہوگئی، اب رہی بات کہ آپ کو صرف سترہ کے قریب حدیثیں یاد تھیں، تو اس کو سوائے ابن خلدون نے اور کسی متعصب شخص نے ذکر نہیں کیا ہے، اور خود ابن خلدون کے بھی مبہم عبارت سے اسے بیان کیا ہے۔ اس بات کی غلطی اس سے واضح ہو جاتی ہے کہ جن مسانید کا اوپر ذکر کیا گیا ان میں امام صاحب کی صحیح احادیث بے شمار ہیں۔ اور خود فقہ میں آپ سے منقول صحیح احادیث سیکڑوں سے متجاوز ہیں۔ (السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی)۔

(بقیہ آئندہ)

☆☆☆

❑ تاریخ

جنوبی ہند کی مسلم حکومتیں اور ان کے علمی و مذہبی رجحانات

ذیشان سارہ
اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

دہلی کی تغلق حکومت کے دور میں جب مرکز کی گرفت دور دراز کے صوبوں پر کمزور پڑنے لگی، تو یکے بعد دیگرے صوبے آزاد ہوتے گئے اور ان میں علاقائی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ جنوبی ہند کی بہمنی حکومت اسی موقع پر قائم ہونے والی ایک صوبائی حکومت تھی جس نے مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ بہمنی حکومت کے زوال کے بعد اس کے بطن سے پانچ ریاستی حکومتوں نے جنم لیا، اور ان سب نے اپنے اپنے خطوں میں مہتم بالشان کارنامے انجام دئے۔ جس زمانے میں ہندوستان کے مرکز میں سیاسی اتھل پتھل مچی ہوئی تھی، اور دہلی سلطنت کی بنیادوں پر سوری حکومت اور مغل حکومت کی عمارتیں تعمیر ہو رہی تھیں، اس زمانے میں جنوبی ہند کے اندر بھی ہند اسلامی تہذیب و تمدن کا فروغ انجام پا رہا تھا۔ جنوبی ہند کی ان ریاستوں میں گو کہ مرکز کے ساتھ بھی اور خود باہم بھی ٹکراؤ کی فضا قائم رہی، اور اس کے نتائج نے کئی محاذوں پر نقصانات مرتب کئے، لیکن بہمنی حکومت اور اس کے بعد کی پانچ علاقائی حکومتوں کا یہ پورا دور علم و تمدن کے میدان میں اپنے نقوش ثبت کرتا رہا۔

دکن کی یہ پانچ سلطنتیں افغان، ترک، فارسی، اور منگول نسل کی پانچ مخلوط خاندانی سلطنتیں تھیں جنہوں نے بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، بیدر اور برار پر حکمرانی کی۔ یہ 5 ریاستیں بہمنی حکومت کے زوال کے بعد اس وقت وجود میں آئیں جب 1527 میں بہمنی سلطنت کے آخری بادشاہ کے انتقال کے بعد اس کے 5 صوبوں کے امیروں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ یہ ریاستیں سیاسی، علمی اور مذہبی اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ اور وہی اہمیت بہمنی سلطنت کو بھی حاصل ہے۔ زیر نظر سطور میں بہمنی سلطنت اور اس کے ٹوٹنے سے وجود میں آنے والی 5 سلطنتوں کے دور کے علمی اور مذہبی رجحانات پر نظر ڈالی جا رہی ہے۔

مسلم حکومتوں کا اجمالی خاکہ : بہمنی سلطنت : چودھویں صدی میں ہندوستان کے اندر فارسیوں کی آمد کے ساتھ ہی دکن میں ایک نئی ہند اسلامی ترکیب کا ظہور ہونا شروع ہو گیا تھا۔ سلطان محمد تغلق کے آخری زمانے میں دکن کے امیروں نے بغاوت کی اور شاہی فوج کو بار بار شکست دی، اور سب نے مل کر 748ھ (1347ء) میں حسن گنگو نامی ایک امیر کو علاء الدین کا خطاب دیکر بادشاہ بنا لیا۔ علاء الدین نے اپنی تدبیر اور جنگی قوت کے ذریعہ سارے دکن کو اپنے تابع بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ اس نے نہ صرف برہمنوں کو اپنا شریک کار بنایا بلکہ اپنا خاندانی نام بھی بہمن رکھا۔ یہ حکومت کل 180 سال تک قائم رہی جس میں درج ذیل 18 حکمراں گذرے۔

1- علاء الدین حسن گنگو 1347-1358
2- محمد شاہ اول: 1358-1375

3- مجاہدشاہ : 1375-1378
4- داؤدشاہ : 1378
5- محمدشاہ دوم : 1378-1397
6- غیاث الدین شاہ : 1397
7- شمس الدین : 1397
8- فیروزشاہ : 1397-1422
9- احمدشاہ : 1422-1436
10- علاءالدین احمد : 1436-1458
11- ہمایوں شاہ : 1458-1461
12- نظام شاہ : 1461-1463
13- محمدشاہ سوم : 1463-1482
14- محمودشاہ : 1482-1518
15- احمدشاہ دوم : 1518-1521
16- علاءالدین شاہ دوم : 1521-1522
17- ولی اللہ شاہ : 1522-1525
18- کلیم اللہ شاہ : 1525-1527

بہمنی حکومت کے زوال کے ساتھ ہی اس کے ماتحت علاقوں کے امیروں نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا، اوراس طرح بہمنی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہی پانچ ریاستی حکومتوں کا قیام عمل میں آ گیا۔ یہ حکومتیں نظام شاہی، قطب شاہی، عادشاہی، برید شاہی اور برارشاہی کے ناموں سے وجود میں آئیں۔ ذیل میں ان سلطنتوں کا اجمالی تعارف درج ہے۔

نظام شاهی سلطنت :

سلطنت نظام شاہی کے بانی نظام الملک بحری کا اصل نام ملک حسن ہے، یہ خالص دکنی ہندو تھا جو مسلمان ہوگیا تھا۔ بہمنی حکومت کے اندر یہ پہلے امیر شکار ہوا، پھر نائب وزیر بنا۔ خواجہ جہاں محمود گاواں کے مرنے پر سلطان محمود بہمنی کے زمانے میں وزیر کل بنایا گیا۔ اس کا لڑکا ملک احمد باپ کی جاگیر کا انتظام کرتا تھا۔ نظام الملک کے مرنے پر اس نے سلطنت کو اس خوبی سے جمایا کہ اس کی کوئی کل ڈھیلی نہ رہنے دی۔ محمود بہمنی کے وزیروں سے ہمیشہ اس کی لڑائی رہتی، جب آخری جنگ میں ملک احمد کی فتح ہوئی تو 1489ء میں اس نے وہاں بطور یادگار ایک باغ لگادیا۔ اس کے بعد ہی اس نے نظام شاہ اپنا نام رکھا۔ 1490ء میں دولت آباد کے مقابل ایک شہر احمد نگر بسا کر اس کو پایہ تخت بنایا(1)۔ یہ سلطنت 1636-1490 تک قائم رہی جس میں 14 حکمراں گذرے۔

1- ملک احمد نظام شاہ اول : 1490-1510
2- برہان نظام شاہ اول : 1510-1553
3- حسین نظام شاہ : 1553-1565
4- مرتضٰی نظام شاہ : 1565-1588
5- میران نظام شاہ : 1588-1589
6- اسماعیل نظام شاہ : 1589-1591
7- برہان نظام شاہ دوم : 1591-1595
8- ابراہیم نظام شاہ : 1595-1596
9- احمد نظام شاہ : 1596
10- بہادر نظام شاہ : 1596-1600
11- مرتضٰی نظام شاہ دوم : 1600-1610
12- برہان نظام شاہ دوم : 1610-1631
13- حسین نظام شاہ دوم : 1631-1633
14- مرتضٰی نظام شاہ سوم : 1633-1636

عادل شاهی سلطنت:

اس سلطنت کا بانی یوسف' بہمنی حکومت کا ایک ترک افسر تھا، شروع میں اصطبل کا داروغہ رہا، کچھ دنوں کے بعد بیجاپور کا صوبہ دار بھی بن گیا۔ سلطان محمود بہمنی کے بعد 1489ء میں اس نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا، اوراپنا نام عادل شاہ رکھ لیا۔ یہ ریاست

دکن کی تمام ریاستوں میں سب سے زیادہ مضبوط تھی اور دوسو برس سے زیادہ مدت اس کی حکومت قائم رہی جس میں کل 9 حکمراں ہوئے(2)۔

1- یوسف عادل شاہ	:	1490-1510
2- اسمٰعیل عادل شاہ	:	1510-1534
3- ملوعادل شاہ	:	1534-1535
4- ابراہیم عادل شاہ	:	1535-1558
5- علی عادل شاہ اول	:	1558-1580
6- ابراہیم عادل شاہ دوم	:	1580-1627
7- محمد عادل شاہ	:	1627-1656
8- علی عادل شاہ دوم	:	1656-1672
9- سکندر عادل شاہ	:	1672-1686

عماد شاہی سلطنت:

اس سلطنت کا بانی عماد الملک فتح اللہ تھا۔ یہ برار کا صوبہ دار تھا، بہمنی سلطنت کے زوال کے بعد 1490 میں اس نے خودمختاری کا اعلان کیا، اور عماد شاہی سلطنت کی بنیا د ڈالی ۔1576ء میں اس سلطنت کے آخری حکمراں تفال خان اوراس کے خاندان کے تمام لوگ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے اور برار کو نظام شاہی سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔اس سلطنت میں صرف پانچ حکمراں گذرے ہیں:

1- عماد الملک فتح اللہ	:	1490-1504
2- علاءالدین عماد شاہ	:	1504-1530
3- دریا عماد شاہ	:	1530-1562
4- برہان عماد شاہ	:	1562-1568
5- تفال خان	:	1568- 1572

قطب شاہی سلطنت:

اس سلطنت کا بانی سلطان قطب الملک ہے ۔اس نے محمد شاہ کے زمانے میں بہمنی سلطنت میں شمولیت اختیار کی، پھر گولکنڈہ کو فتح کر کے 1518 میں وہاں کا حاکم بنا۔ جب بہمنی سلطنت کمزور ہوئی تو اس نے بھیخو دمختاری کا اعلان کر دیا، اور قطب شاہی سلطنت وجود میں آ گئی۔ یہ حکومت 171 سال قائم رہی ، تا آنکہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے 1681 میں گولکنڈہ کو فتح کر لیا۔اس میں کل 8 حکمراں رہے۔

1- قلی قطب الملک	:	1518-1543
2- جمشید قلی قطب شاہ	:	1543-1550
3- سبحان قلی قطب شاہ	:	1550
4- ابراہیم قلی قطب شاہ:		1550-1580
5- محمد قلی قطب شاہ	:	1580-1611
6- سلطان محمد قطب شاہ:		1611-1626
7- عبداللہ قطب شاہ	:	1626-1672
8- ابوالحسن قطب شاہ	:	1672-1687

برید شاہی سلطنت:

بیدر کی سلطنت' دکنی سلطنتوں میں سب سے چھوٹی سلطنت تھی۔ محمد قاسم برید جو کہ برید شاہی سلطنت کا بانی تھا' دراصل ایک ترکی غلام تھا۔ یہ 1492ء میں محمود شاہ بہمنی کے دور میں خودمختار ہوا، اور برید شاہی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ 1619ء میں یہ سلطنت بیجاپور کی سلطنت میں شامل کر دی گئی ۔ برید شاہی سلطنت میں 9 حکمراں ہوئے۔

1- قاسم برید اول	:	1492-1504
2- امیر برید اول	:	1504-1542
3- علی برید اول	:	1542-1580
4- ابراہیم برید شاہ	:	1580-1587
5- قاسم برید دوم	:	1587-1591
6- علی برید شاہ دوم	:	1591
7- امیر برید شاہ دوم:		591-1600

8- مرزا علی برید دوم : 1600-1609

9- امیر برید شاہ سوم: 1609- 1619

جنوبی ہند کی مسلم حکومتوں میں علمی رجحانات:

بہمنی سلطنت کے دور میں سلاطین کو علم سے کافی دلچسپی رہی، خصوصاً ادب اور شاعری سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ وہ ہمیشہ کوشش کرتے کہ بڑے بڑے علماء ان کے دربار سے وابستہ رہیں۔ چنانچہ وہ ایران سے علماء وادباء اور ماہرین کو اپنے دربار سے وابستہ ہونے کی دعوت دیتے۔ محمود شاہ دوم خود بھی اچھا شاعر اور علم نواز بادشاہ تھا، عربی اور فارسی کا عالم تھا۔ عالم عرب اور ایران سے شعراء کو دکن میں بلاتا رہا تا کہ اپنے ملک کو علم اور تہذیب کا مرکز بنا سکے۔ میر فضل اللہ انجو اس کے دربار سے وابستہ تھے جو سعد الدین تفتازانی کے شاگرد اور بلند پایہ عربی مصنف تھے۔ اس نے انجو کو صدر جہاں کے لقب سے نوازا (3)۔ اس نے خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی کو بھی دکن بلانے کی کوشش کی اور دکن کے سفری خرچ کے لیے بڑی رقم فراہم کی، لیکن وہ سمندری طوفان کی وجہ سے نہیں آسکے، اور معذرت کے طور پر ایک خوبصورت غزل لکھ کر بھیجی۔ بہمنی سلاطین نے سلطنت کے مختلف شہروں اور قصبوں جیسے گلبرگہ، بیدر اور دولت آباد وغیرہ میں معلم مقرر کر دئے تھے اور طلبہ کو جو اسلامی علوم میں مشغول ہوتے، وظیفے دیا کرتے تھے (4)۔

علاؤالدین حسن شاہ کے دور میں حسن کے مؤرخ اور مداح عصامی تھے جنھوں نے 'فتوح السلاطین' لکھی۔ اسی طرح عین الدین بیجاپوری نے منہاج السراج کی طبقات ناصری پر ملحقات یا ضمیمہ لکھا۔ بہت سے ممتاز اہل علم جیسے مفتی احمد بردی، نصیر الدین تبریزی، میر محمد بدخشی، سیف الدین محوری، میر فضل اللہ انجو اور متعدد دیگر فضلاء نے دکن میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ تاج الدین فیروز بڑی علمی قابلیت کا انسان تھا۔ محمد گزرونی اور حسن گیلانی علم نجوم کے ماہر تھے۔ اسی طرح ازری اصفہانی ''بہمن نامہ'' کا مصنف تھا جو شاہنامہ فردوسی کے وزن پر بہمنی خانوادہ کی منظوم تاریخ ہے (5)۔

دکن کی علمی تاریخ میں باعظمت اور مشہور نام خواجہ محمود گیلانی کا ہے جن کا عرف ان کے پیدائشی شہر 'گاواں' کے نام پر محمود گاواں ہے۔ یہ 1455ء میں ایران سے دکن آئے۔ محمود گاواں نے بہمنی سلطنت میں وزارت عظمیٰ کی خدمات انجام دیں۔ انھوں نے فوجی قیادت اور انتظام مملکت کے ساتھ علمی حیثیت میں اتنا بڑا نام پیدا کیا کہ قرون وسطیٰ کے دکن میں کوئی ان کا مدمقابل نہ تھا۔ ان کے خطوط کا مجموعہ ''ریاض الانشاء'' اور فارسی طرز پر ان کی تصنیف ''مناظر الانشاء'' فارسی نظم ونثر میں ان کی اعلیٰ قابلیت کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی خط وکتابت دیگر مشاہیر عالم کے ساتھ ساتھ سلطان محمد دوم فاتح قسطنطنیہ سے بھی تھی (6)۔ ان کی علم نوازی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ دکن کے فن تعمیر کی یادگاروں میں جو عمارتیں نامور ہوئیں وہ فوجی عمارتیں نہ تھیں بلکہ شاندار عمارت بیدر کا عظیم الشان کالج ہے جس کی فکر ان کو ہمیشہ لاحق رہتی تھی۔ اس عظیم مرکز علم کے چاروں طرف بہت بڑا احاطہ ہے جس میں ایک ہزار افراد کی رہائش کے لئے کمرے بنے ہیں، یہاں سارے مشرق سے نامور علماء اور معلمین جمع ہوتے تھے، اور طلبہ کو صرف ذہنی غذا ہی نہیں فراہم کی جاتی تھی، بلکہ کھانا کپڑا بھی مفت ملتا تھا۔ اس مدرسہ میں ایک بہت بڑی لائبریری بھی تھی۔ اس مدرسہ کو محمود گاواں نے 1472 میں مکمل کرایا تھا۔

نظام شاہی دور میں شاہ طاہر کی بڑی اہمیت تھی، انھوں نے نظام شاہی حکومت میں عظیم سیاسی ذمہ داری نبھائی۔ وہ سلاطین کو سیاسی امور میں اہم مشورے دیا کرتے تھے۔ 928ھ میں وہ احمد نگر تشریف لائے اور انہیں مصاحبین شاہی میں داخل کر لیا گیا (7)۔ انہوں نے نظام شاہی خاندان کی بڑی خدمت کی، اور شاہی خزانے سے روپیہ حاصل کر کے عراق، خراسان، فارس، روم، گجرات اور آگرہ روانہ کیا اور شیعہ عالموں و فاضلوں کو احمد آباد آنے کی دعوت دی۔ ان کی

کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی عرصے میں احمد نگر میں عالموں اور فاضلوں کی ایک عظیم الشان جماعت مہیا ہوگئی۔ شاہ حسن انجو، جعفر ملا ہیہ پشاوری، ملا علی گل استر آبادی اور دوسرے بہت سے علماء وفضلاء احمد نگر میں آئے اور یہ شہر علم کی جنت بن گیا۔(8)

عادل شاہی سلطنت دکن کی ساری سلطنتوں میں سب سے زیادہ مضبوط تھی۔ دوسو برس کی حکومت میں سیاست کے ساتھ ساتھ علم کی سرپرستی بھی جاری رہی۔ اسماعیل عادل شاہ خود بلند ہمت اور رحمدل بادشاہ تھا، ہمیشہ عالموں اور فاضلوں کی معیت میں رہتا۔ موسیقی اور شعر سے خاص رغبت تھی، خود بھی شاعر تھا اور وقافی تخلص کرتا تھا۔ عالموں ،صوفیوں اور خاص کر ایرانی لوگوں کی بڑی عزت کرتا تھا(9)۔ پہلے سلطان یوسف عادل شاہ کی محفلوں میں بھی ہمیشہ شعرائے قدیم کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ وہ خود بھی اشعار کہتا تھا۔ یوسف نے اپنے زمانہ اقتدار میں ایران، توران، عرب اور روم جیسے ممالک میں خطوط بھیج کر وہاں کے فضلاء علماء، اہل ہنر، اور اعلیٰ قابلیتو ں کے لوگوں کو بیجا پور بلوایا (10)۔ علی عادل شاہ نے ایرانیوں کو وظائف دے کر انہیں حکم دیا کہ مسجدوں اور بازاروں میں بغیر کسی اندیشے اور روک ٹوک کے اپنا کام جاری رکھیں۔ وہ عالموں اور فاضلوں وغیر کی بہت قدردانی کرتا اور انہیں اعلیٰ عہدوں سے نوازتا تھا۔ اس نے قابل اور اعلیٰ صلاحیتوں کے لوگوں کو اپنے دربار میں جمع کرنے کی طرف توجہ دی (11)۔ برہان شاہ کے دور میں خواجہ شیرازی جیسی شخصیت نے علم کی خدمت انجام دی، یہ بہت بڑے بزرگ تھے، انہیں علم منطق وحکمت سے بہت دلچسپی تھی، اور کئی کتابیں تصنیف کیں۔

عادل شاہی حکمرانوں کی سرپرستی میں بہت سے ادبی کام دکنی زبان میں انجام دئے گئے۔ خود ابراہیم عادل شاہ دوم نے بھی دکنی زبان میں کتاب لکھی۔ اسی کے حکم پر مشہور مورخ قاسم فرشتہ نے اپنی مشہور تاریخ ''گلشن ابراہیمی'' لکھی جو' تاریخ فرشتہ' کے نام سے مشہور ہے (12)۔ گو کہ عادل شاہی حکومت کے سلاطین کی نظام شاہی حکومت اور دیگر حکومتوں کے ساتھ ہمیشہ چپقلش جاری رہی، لیکن پھر بھی ملک کی تعمیر وترقی اور علمی فروغ سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ انہوں نے مراٹھی زبان کو بھی ترقی دی۔ ایران ، ترک اور روم سے شاعروں اور فنکاروں کو بلایا (13)۔ پہلی بار عادل شاہی اور قطب شاہی دربار میں ہی اردو زبان کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی، چنانچہ نصرتی اردو کا ممتاز شاعر تھا اور علی عادل شاہ کا ملک الشعراء تھا(14)۔

دکن کی حکومتوں میں مذہبی رجحانات:

دکن کی مسلم حکومتوں نے مذہبی رواداری کے باب میں بھی نام کمایا ہے۔ چنانچہ بہمنی سلطنت میں بہت واضح طور پر مذہبی رواداری پائی جاتی تھی۔ مقامی ہندؤں کے ساتھ ان کے اچھے روابط استوار تھے۔ اور وہ بھی مسلم حکومتوں سے اثر پذیر ہو رہے تھے، جس کے اثرات ان کی مذہبی عمارات میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس سلطنت میں برہمنوں کو اونچے اونچے عہدوں سے نوازا گیا۔ خصوصیت کے ساتھ سلطان فیروز شاہ کے ہندؤوں سے خوشگوار تعلقات تھے۔

جہاں تک مسلمانوں کے مابین مسلکی رواداری اور باہمی مفاہمت کا تعلق ہے' تو اس دور میں اس بابت بھی رواداری نظر آتی ہے۔ نظام شاہی دور میں ایران سے ایک شیعہ عالم شاہ طاہر اسماعیل نے سولھویں صدی میں دکن کا دورہ کیا، اور بہت جلد انھوں نے حکومت میں وزیر کی حیثیت حاصل کر لی اور حکومت کی مذہبی پالیسی میں اپنا اثر ورسوخ پیدا کر لیا۔ ان ہی کے زیر اثر یہاں شیعہ مذہب سرکاری مذہب کے طور پر رائج ہوگیا۔ احمد نگر میں شیعہ مذہب کا اثر اشرافیہ کی ثقافت پر کئی نسلوں تک پایا جاتا رہا۔ شیعہ مذہب کے ساتھ ان کی عقیدت کی وجہ سے اس علاقے میں کئی نئے رجحانات پیدا ہوئے (15)۔ چنانچہ برہان نظام شاہ کے دور میں شیعہ مذہب عام ہوگیا اور تینوں خلفاء کے نام خطبے سے نکال کر ائمہ اہل

بیت کے نام کا خطبہ جاری کیا گیا۔شیعیت کے اثرات دربار کے دیگر مراسم پر بھی ظاہر ہونے لگے تھے(16)۔

عادل شاہی دور کے پہلے حکمراں یوسف عادل شاہ نے ایک خواب دیکھا تھا، اور اس نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کیا تھا کہ اگر وہ بادشاہ کے درجہ پر پہنچ گیا تو وہ بارہ اماموں کے اسمائے گرامی خطبہ میں شامل کرے گا، اور شیعہ مذہب کو رواج دے گا۔ پھر ملک میں سیاسی ہنگاموں کے زمانے میں بھی اس نے عہد کیا تھا کہ اگر وہ دشمن پر غالب آئیگا تو شیعہ مذہب کو رواج دینے کی پوری کوشش کریگا۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا، اور اپنے عہد کو پورا کرتے ہوئے شیعہ مذہب کے فروغ کی کوشش کی(17)۔

لیکن یوسف عادل شاہ کے بعد حکومت میں شیعہ مذہب کے ساتھ حنفی اور شافعی علماء کی بھی شمولیت ہوگئی ، اور وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ بہت خلوص سے ملنے اور پیش آنے لگے، اور مذہبی رواداری کا منظر دیکھا گیا(18)۔

یوسف عادل نے تمام حنفی المذہب امراء کو یہ ہدایت بھی جاری کررکھی تھی کہ وہ اپنی جاگیروں میں اپنے عقیدوں کے مطابق اذان دیں،اس کے علاوہ یوسف نے تمام حکام کو یہ فرمان بھیجا تھا کہ وہ اہل سنت کے طریقہ پر عبادت میں کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ کریں (19)۔ یوسف کے شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب کے طور پر اعلان کرنے کے بعد فارس سے بہت زیادہ لوگ ہجرت کرکے دکن آگئے تھے۔سولھویں صدی شیعہ مسلمانوں کے لئے مذہبی سرگرمی کا دور رہا، اور فارس کے شاہ اسماعیل صفوی کی رہنمائی میں شیعہ مذہب کی تبلیغ کی رفتار تیز رہی۔ 1514 میں شاہ اسماعیل صفوی نے بیجاپور کے دربار میں بیش قیمت تحائف کے ساتھ اپنے سفیر کو بھیجا(20)۔

عادل شاہی حکمران ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری اور ان کے مذہبی معاملات میں عدم مداخلت کیلئے مشہور تھے۔انھوں نے ہندوؤں کو اپنے درباروں میں اونچے عہدے دئے ، اور خاص طور سے خزانہ اور انتظامیہ کی ذمہ داریاں ان کے سپرد کیں(21)۔

عادل شاہی کی طرح قطب شاہی بادشاہوں نے بھی شیعہ مذہب کا اعلان کیا۔وہ شیعہ علماء کی حمایت کرتے تھے،اور امام حسینؓ کی شہادت کی یادگار کے لئے عاشور خانے قائم کئے ۔انھوں نے مساجد، مدرسے اور قبرستان بھی تعمیر کرائے ۔ جمعہ کے خطبوں میں بارہ اماموں کے نام ذکر کیے جانے لگے۔ان سرکاری سرپرستیوں کی وجہ سے شیعہ مذہب اشرافیہ حکمرانوں کا مذہب بن گیا اور شاہی تائید کی وجہ سے اسے مقبولیت حاصل ہوتی گئی،البتہ اس کے باوجود دکن میں سنی مذہب بھی قائم رہا۔

ایک فرانسیسی سیاح برنیر نے اس زمانے میں گولکنڈہ کا دورہ کیا تھا۔ اس نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے کہ قطب شاہی سلطنت میں عظیم جوش کے ساتھ شیعوں کے قانون کو برقرار رکھا جاتا ہے،ان کے دربار میں سب سے اونچے مقام پر ایرانی ہیں، فارس کی طرح یہاں بھی آزادی کے ساتھ شیعوں کے رسوم ورواج کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔

قطب شاہی سماج میں شیعہ،سنی ،صوفی اور ہندو یکساں طور پر نظر آتے ہیں۔مذہبی ہم آہنگی کی برقراری کے لئے قطب شاہی بادشاہوں نے مذہبی ادارے جیسے مٹھ، مساجد، درگاہیں، خانقاہیں اور عاشور خانے تعمیر کروائے ،تاکہ ان کو اپنی مذہبی تبلیغ اور اپنے مذہبی رسومات کی ادائیگی کے مواقع فراہم ہوں۔ ان مذہبی اداروں کا دوسرا بڑا مقصد سماج میں مذہبی ہم آہنگی اور روحانی فلاح و بہبود تھا۔ عظیم مذہبی اور روحانی مراکز کے ساتھ ساتھ ان اداروں نے بھی عوام کے جذبات کو Chennelised کیا اور لوگوں کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور ثقافتی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ۔ قطب شاہی بادشاہوں نے مختلف ثقافتوں کو بیک وقت ترقی دی، جہاں سارے عوام کو امن اور فلاح و بہبود حاصل تھی(22)۔

خلاصہ :

جنوبی ہند کی مسلم سلطنتیں ہندوستان کی مسلم تاریخ کا اہم حصہ

ہیں۔انھوں نے اس علاقے پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، اور آج تک ان کے آثار پائے جاتے ہیں ۔جنوبی ہند کی مسلم سلطنتوں نے اس علاقے میں بڑے کارہائے نمایاں انجام دئے۔ انھوں نے تہذیب وتمدن کے فروغ کے ساتھ ساتھ علم اور خصوصاً ادب وشاعری اور لسانی ترقی پر بہت زیادہ توجہ دی۔اس دور میں مراٹھا اور فارسی زبانوں کو عروج حاصل ہوا۔عادل شاہی اور قطب شاہی دور میں اردو زبان کو بھی خاص مقبولیت حاصل ہوئی۔اس دور میں ایران وغیرہ سے بہت سے اہل علم فضلاء نے دکن میں آ کر اپنی علمی خدمات انجام دیں۔ان تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کا سہرا دکن کی مختلف ریاستوں کے حکمرانوں کے سر جاتا ہے، کہ ان کی علم دوستی ہی وجہ سے دکن علم وادب کا بھی گہوارہ بنا۔

مذہبی اعتبار سے دیکھا جائے تو اس دور میں دکن کے اندر شیعیت کو فروغ حاصل ہوا، شیعہ مذہب کو سرکاری مذہب کے طور پر بھی اختیار کیا گیا۔لیکن اس کے باوجود سنی مذہب کے لئے بھی راہِ آزادی برقرار رکھی گئی تھی ،سنی علماء نے بھی مذہبی آزادی کے ساتھ اپنی سرگرمیاں انجام دیں اور مختلف علمی اور دینی خدمات انجام دئے۔

حواشی

1- ندوی، سید ابوظفر (2006) مختصر تاریخ ہند، ص123 اعظم گڑھ ،دارالمصنفین شبلی اکیڈمی۔

2- ندوی، سید ابوظفر (2006) مختصر تاریخ ہند، ص123 اعظم گڑھ ،دارالمصنفین۔

3- فرشتہ، محمد قاسم (1998): تاریخ فرشتہ، ص303، جلد اول ،دیوبند، اشرفی بکڈپو۔

4- شیروانی، ہارون خان (1998) دکن کے بہمنی سلاطین، ص96 نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔

5- ایضاً: ص324

6- ایضاً: ص181

7- فرشتہ، محمد قاسم (1998): تاریخ فرشتہ، ص181، جلد اول ،دیوبند، اشرفی بکڈپو۔

8- ایضاً 195

9- ندوی، سید ابوظفر۔(2006) مختصر تاریخ ہند، ص133 اعظم گڑھ ،دارالمصنفین۔

10- فرشتہ، محمد قاسم (1998): تاریخ فرشتہ، ص51، جلد اول ،دیوبند، اشرفی بکڈپو۔

11- ایضاً ص99۔

12- Farooqui, Salma Ahmed (2011): A comprehensive History of Medival India, P 176, Delhi, Punch Sheel Park, India, Dorling Kindersley

13- صولت، ثروت۔(2012): ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ص286، نئی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔

14- صولت، ثروت۔(2012): ملت اسلامیہ کی مختصر تاریخ، ص286، نئی دہلی، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز۔

15- شیروانی، ہارون خان (1998) دکن کے بہمنی سلاطین، ص96 نئی دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان۔

16- Farooqui, Salma Ahmed (2011): A comprehensive History of Medival India, P 176, Delhi, Punch Sheel Park, India, Dorling Kindersley

17- فرشتہ، محمد قاسم (1998): تاریخ فرشتہ، ص193، جلد اول ،دیوبند، اشرفی بکڈپو۔

18- ایضاً ص 46

19- ایضاً ص 46

20- ایضاً ص 46

21- Farooqui, Salma Ahmed (2011): A comprehensive History of Medival India, P 176, Delhi, Punch Sheel Park, India, Dorling Kindersley

22- ایضاً، P 170

☆☆☆

❑ احوال عالم

ایک دہشت گرد کی ڈائری سے

شان محمد ندوی
استاذ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ علی گڑھ

نیوزی لینڈ کے شہر کرائسٹ چرچ میں ایک سفید فام نسل پرست ،تربیت یافتہ دہشتگرد برنٹن ٹیرنٹ نے جمعہ کی نماز کے دوران دو مساجد میں فائرنگ کرکے پچاس مسلمانوں کو شہید کردیا، اس المناک واقعہ نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ یہ واقعہ ایک طرف تو انسانیت کا درد رکھنے والے لوگوں کے لئے ماتم کا ذریعہ ہے، تو دوسری طرف انسانیت کے دشمنوں کے لیے خوشی کا ساماں بھی ہے، یہ واقعہ جتنا غمناک ہے، اس سے کہیں زیادہ قابل فکر ہے، کہ کہیں یہ واقعہ صلیبی جنگوں کا حصہ تو نہیں ہے، یا اہل یورپ کی اسلام دشمنی کا جزء تو نہیں، اسی لئے اس حملے کی اصل بنیاد تک پہنچنا اور آئندہ کے لیے اس طرح کے واقعات کے سدباب کے لئے قدم آگے بڑھانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ حملہ آور کا تعلق سفید فام نسل سے ہے، جس کا نام برنٹن ٹیرنٹ ہے، جس کے رگ وریشہ میں تعصب اور نسل پرستی ،مہاجروں سے نفرت اور اسلام سے عداوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جو ایک عام آدمی نہیں ہے، بلکہ بحری سیل کا نمایاں، اسلام کے خلاف متعدد خفیہ آپریشن میں شریک رہنے والا، گوریلا جنگ کی ٹریننگ لینے والا، امریکی فوج کا ماہر نشانہ باز، U.S.M.(United States Marine Corps) کے اسلحے خانہ تک رسائی رکھنے والا اور انٹرنیٹ کا ماہر شخص ہے۔ جو بنیادی طور پر '' Sir Oswald Mosley" ,"Dylan Osbourne" ,"Anton Lundin" ,"Dylan Roof" ,"Anders Owens" ,"Luca Traini" ,"Condace Breivik" ان تمام متعصب اسلام مخالف شخصیات کے عقائد و نظریات کو اپنانے والا، ڈیلین روف اور Knight Justiciar Breivik کی تحریروں سے بہت زیادہ متاثر ہونے والا شخص ہے۔ ان تمام صفات کے ساتھ ساتھ ایک بڑا سیاح بھی ہے۔ یہ صرف اس حملہ آور کی کہانی ہے جس کو پوری دنیا ایک معمولی سفید فام شخص، کم آمدنی والے محنت کش گھرانے میں پیدا ہونے والا اور تعلیم میں بہت کم دلچسپی رکھنے والا سمجھتی ہے۔ اس حملہ آور سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا دشمن ہمارے مقابلے میں کتنا بڑھا ہوا ہے اور ہمیں نیست و نابود کرنے میں کتنی محنت کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہمارا اپنا جو حال ہے، ہماری اپنی جو تیاری ہے وہ ہمارے سامنے ہے لہذا ہمیں اس وقت ہوش کے ناخن لینے کی ضرورت ہے۔

حملہ کے بنیادی اسباب اور ہماری غفلت:

یہ حملہ دراصل اسلام سے ماضی میں کھائی ہوئی شکست فاش اور اسلام دشمنی پر مبنی ہے جس کی چبھن ابھی بھی اہل یورپ اپنے دل میں محسوس کررہے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں سے وہ نفرت و عداوت جس کی آگ ابھی بھی ان کے سینوں میں جل رہی ہے اسی لئے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے برنٹن ٹیرینٹ لکھتا ہے کہ ''یہ حملہ میں نے اپنی قوم کو بیدار کرنے کے لیے کیا ہے اور ان

لاکھوں یورپی مردوں اور عورتوں کے خون کا بدلہ لینے کے لیے کیا ہے جنہوں نے اپنی زمینوں کی اور اپنے لوگوں کی حفاظت کے لیے اپنی جانوں کو قربان کر دیا، یہ حملہ میں نے ان اسلام پسند مہاجرین کی تعداد کو کم کرنے کے لیے کیا ہے جو ہماری زمینوں پر آکر آباد ہو رہے ہیں، اپنی شرح پیدائش میں اضافہ کر رہے ہیں اور اپنی تہذیب وثقافت کو بڑھاوا دے رہے ہیں جس کی وجہ سے ہماری زمین ہمارے ہی لوگوں پر تنگ ہوتی چلی جا رہی ہیں''۔

آگے لکھتا ہے کہ:

''اگر مہاجرین کی تعداد اسی طرح بڑھتی رہی تو آگے چل کر ہم حق رائے دہی سے بھی محروم ہو جائیں گے، ہمارا سماج برباد ہو جائے گا، ہماری نسلی سرحدیں تباہ ہو جائیں گی اور اس سے بڑھ کر ہمارا نام ونشاں تک بھی باقی نہ رہے گا اسی وجہ سے اپنی شرح پیدائش میں اضافہ کرنے سے پہلے ان اسلام پسند مہاجرین سے نمٹنا ضروری ہے جو ہمارے علاقوں میں آرہے ہیں یا آنے کے خواہاں ہیں، اور ہماری حکومتوں کو ان کی آمد پر پابندی لگانی ہوگی اور جو مہاجرین ہماری سرزمین پر پہلے سے آباد ہیں ان کو ملک بدر کرنا ہوگا کیونکہ اسی میں ہمارے لوگوں کی ترقی کا راز مضمر ہے''۔

مزید لکھتا ہے کہ:

''میں اس حملے کے ذریعے مغربی روح کو بیدار کرنا چاہتا ہوں اور ان کو بتانا چاہتا ہوں کہ جن کو تم گلے لگاتے ہو وہ تمہارے دوست نہیں ہیں بلکہ تمہارے ابدی دشمن ہیں، اپنے دشمن کو پہچانو، اسی لئے دنیائے مغرب کو یہ کوشش کرنا چاہیے کہ وہ نیٹو کو صرف یورپ کی متحدہ فوج بنائے اور جو اسلامی ممالک اس کے ممبر ہیں ان کو الگ کر کے نیست و نابود کر دے۔ ایک طرف ہمارا دشمن ہمارے لوگوں کو ہماری تہذیب کو ختم کرنے پر تلا ہوا ہے تو دوسری طرف ہماری یہ غفلت کہ ہم بیدار ہونے کیلئے بھی تیار نہیں ہیں۔اس کا مقابلہ کرنے اور کوئی بھی حکمت عملی طے کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس یورپ کی مصنوعی و مادی دنیا کی طرف بھاگے چلے جا رہے ہیں''۔

اعلیٰ سطحی قیادتوں کا خاتمہ:

پوری دنیا میں جو بھی اسلام پسند اور انسانیت پسند قائدین اور رہنما ہیں، یورپ ان کو موت کے گھاٹ اتار دینا چاہتا ہے، اس لئے وہ کہ ان کے ناپاک مقاصد کی تکمیل میں رکاوٹ بنتے ہیں، برنٹن ٹرینٹ کا یہ پیراگراف اسی ذہنیت کی پوری عکاسی کرتا ہے:

''ہماری قوم ونسل کے کچھ بڑے اور مشہور دشمن ہیں جو ہمارے ہی معاشرے میں اپنے سروں کو عزت سے اٹھا کر چلتے وہ بھی اس گمان کے ساتھ کہ ان کا کوئی بال بیکا نہیں کر پائے گا، ان کی یہ غلط فہمی بہت جلد دور ہو جائے گی، اس لئے کہ میں ان کے لئے موت کا سامان ہوں، ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہے، چاہے تین سال کی جگہ تیس سال لگ جائیں لیکن ان کو ہماری قوم پہ کئے گئے نفرت انگیز حملوں کی سزا مل کر رہے گی، اپنی حفاظت کے وہ چاہے جو طریقے اختیار کر لیں، وہ بچ نہیں پائیں گے، ان کو ان کے کئے کا بدلہ ضرور ملے گا۔

مندرجہ ذیل اعلیٰ قیادت کے حاملین ہمارے سر فہرست بڑے دشمن ہیں:

(۱) انجیلا مارکر جو کہ سرفہرست، سفید فام اور جرمن مخالف اور تمام رکاوٹوں کی جڑ ہے، جس نے یورپ اور اس کے باشندوں کے نسلی صفایا کی ناپاک کوشش کی ہے۔

(۲) اردوغان جو کہ قدیم دشمنوں میں سے ایک ہے، یورپ میں سب سے بڑی اسلامی جماعت کا قائد ہے، یہ جنگی قائد اپنی قوم کی لئے خون کا آخری قطرہ تک بہانے کے لئے تیار رہتا ہے، ابھی حال ہی میں یورپ پر قبضہ کرنے کے ارادہ سے اپنے نسلی فوجوں سے ملاقاتیں کی ہیں۔ اس سپہ سالار کی موت موجودہ ترک حملہ آوروں جو ہمارے زمینوں پر قبضہ کر رہے ہیں اور نسلی یورپین کے بیچ جنگ کا سبب بنے گی اور ساتھ ہی ترکی کا ہولڈ جس خطے پر ہے وہ کمزور پڑ جائے گا، روس کے بنیادی دشمن کا خاتمہ ہو جائے گا اور نیٹو منتشر اور غیر مستحکم ہو جائے گی۔

(۳) صداق خان جو لندن کا موجودہ میئر ہے، برطانوی جریزہ میں اس کا وجود برطانوی لوگوں کی نسلی تبدیلی کی ایک واضح علامت ہے، یہ پاکستانی مسلم حملہ آور لندن کے لوگوں کا نمائندہ

بن کر بیٹھا ہوا ہے، وہ بھی Londinium میں جو کہ برطانوی جزیرہ کا دل ہے، لہذا اس حملہ آور غیر ملکی کو برطرف کرنے اور نکال باہر کرنے کے عمل سے بہتر ایک سفید فام شخص کے لئے کچھ نہیں ہوسکتا ہے لہذا پہلی فرصت میں سفید فام مخالف قائدین انجیلا ماکر، اردوغان اور صادق خان کو قتل کردو''۔

ترکیوں کے نام کھلا پیغام:

برنٹن ٹیرنٹ کا ترکوں کو دھمکی دینا گویا کہ پورے عالم اسلام کو دھمکی دینے کے مترادف ہے۔اس پیراگراف میں خلافت عثمانیہ سے لگی ہوئی دنیائے مغرب کو چوٹ کی پوری عکاسی ہے۔ برنٹن ٹیرنٹ لکھتا ہے کہ:

''تم اپنی زمین میں جہاں چاہے رہ سکتے ہو، کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گا، لیکن تمہاری سرحد باسفورس کی مشرقی پٹی پر ختم ہوجاتی ہے، اور اگر تم نے مغربی زمین پر رہنے کی کوشش کی، اور باسفورس کے مغربی علاقہ پر قدم رکھنے کی سوچ بھی لی تو تمہارا انجام صرف موت ہوگا، اور تم جیسے کیڑوں کو ہم اپنی زمین سے نکال باہر کریں گے۔ ہم آرہے ہیں، قسطنطنیہ کی فتح کے لیے ہم آرہے ہیں، ہر مسجد کو ڈھادیں گے، اور شہر کے ہر مینار کو زمین بوس کردیں گے۔ اور ایک مرتبہ پھر آیا صوفیہ اور قسطنطنیہ کی سر زمین کے حقدار عیسائی ہوجائیں گے۔'' اور اپنی قوم کو للکارتے ہوئے کہتا ہے کہ ''جب تک آیا صوفیہ کے مینارز میں بوس نہیں ہوجاتے اس وقت تک یورپین کو اپنے آپ کو مرد کہنے کا کوئی حق نہیں ہے''۔

برنٹن ٹیرنٹ اپنی قوم کو مندرجہ ذیل باتوں کا سبق دینا چاہتا ہے۔

جانبازوں کی طرح لڑو!

سفید فام دہشت گرد برنٹن ٹرینٹ اپنی قوم کو بہادروں کی طرح جذبہ پیدا کرنے کی اور ناکامیوں سے سبق لینے کی تلقین کرتا ہے:

''ناکامی، خسارہ، قربانی اور رکاوٹوں کا سامنا کیے بغیر ایک مثالی اور مقدس جنگ ناممکن ہے، اسی مقصد کی خاطر ۱۶۸۳ میں ویانا میں ہم یورپیوں نے ۱۶ ہزار ماہر و فعال سپاہیوں کو قربان کردیا، یہ قربانی ایک کامیاب فتح کے لیے تھی، کیا آپ یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان قربانی دینے والے اسلاف سے آپ بہتر ہیں یا ان سے زیادہ زندہ رہنے کے حق دار ہیں یا ان سے زیادہ ماہر اور بہادر ہیں۔ آپ ویسے نہیں ہیں اگر انہوں نے جان دی تو آپ بھی جان دے سکتے ہیں۔ اس فانی دنیا میں زندہ رہنے کی امید مت رکھنا۔ تمہیں صرف ایک ہی چیز کی امید رکھنا ہے وہ ہے مقدس جنگ اور ایک بہادر سپاہی کی موت۔ ایک سپاہی کی طرح لڑو، اسی کی طرح جان دو''۔

حقائق پر جذبات کی حکمرانی:

''عوام کو اعداد و شمار اور پرانے طریقوں کے ذریعے اکسانے اور آمادہ کرنے کی کوشش کو چھوڑ دینا چاہیے۔ خوش سلیقہ الفاظ بیانی اور چابکدستی سے تیار کئے گئے اشتہارات ہی لوگوں کو قائل کرانے کے لیے کافی ہیں۔

انسان فطری طور پر جذباتی ہوتا ہے، اس کے جذبات کے ذریعے مقصد تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے، اور اس کے ذریعے اس کی سوچ کو ایک سمت دی جاسکتی ہے، تو آپ کو اظہار خیال کے بہترین انداز، تجربہ اور سچے جذبات جیسی صفات سے آراستہ ہونا چاہیے، کیونکہ ایک ہی جیسے گھسے پٹے انداز میں بار بار مہاجرین کے متعلق حقائق اور اعداد و شمار کو بیان کرنا اکتاہٹ کا سبب ہوگا، اور عوام ان روایتی اور قدامت پرست غیر مؤثر مقرروں سے دور ہوجائے گی۔

تخلیقی اور جدت طرازی کا مزاج اپنے اندر پیدا کیجئے، اس طور پر کہ جس کے اندر جوش، ولولہ انگیزی کے ساتھ ساتھ جذبات پر قابو بھی نمایاں ہو۔ یہی تمام صفات عوام میں رابطہ اور ان سے بات کرنے اور ان کی فکر کو ایک سمت فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کے لئے موثر طریقہ یہ بھی ہے کہ اپنے نظریے کو پینٹنگ، مضامین، گانے، رقص و سرور اور شعر و شاعری کے ذریعے پیش کیا جائے اور مزید اپنے افکار کو مزاحیہ ویڈیو، کارٹون، تصاویر کو انٹرنیٹ پر وائرل کرکے پیش کیا جاسکتا ہے، اور نسلی قوم پرستی کو بڑھاوا دینے کے لیے یہ طریقہ کار زیادہ مؤثر ہوسکتا ہے۔

اپنے آپ کو غیر مؤثر، اکتا دینے والے اظہار خیال کے قدیم

طریقوں سے دور رکھے''،اس لیے کہ کوئی بھی شخص Bush Jeb سے انسپائر نہیں ہوتا ہے۔

معاشرہ کو زہریلی اشیاء سے پاک کیجئے : منشیات کے ڈیلرز اور جراثیمی زہر کو پھیلانے والے مکمل قانونی پابندیوں کے باوجود نقصان دہ، ضرررساں، خطرناک پروڈکٹس کی سپلائی کر رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے ہمارے اپنے شہروں میں دسیوں ہزار لوگ موت کے گھاٹ اتر رہے ہیں، جن کے ذمہ دار یہی ناخلف لوگ ہیں۔ چاہے قانونی طور پر منشیات کی سپلائی کرنے والے ہوں یا غیر قانونی طور پر دونوں ہمارے نسلی دشمن ہیں کیونکہ ہمارے لوگ یہ مضر صحت اشیاء استعمال کر کے زندگی کی آخری سانسیں لیتے دکھائی دے رہے ہیں، ہمارے اپنے بچوں کی صحت تباہ کی جارہی ہے، خاندانی نظام تباہی کی طرف جا رہا ہے، ثقافت اور مستقبل خطرے میں پڑتا جارہا ہے، اور یہ پلید، گندے، ناپاک گھٹیا قسم کے کاروباری ہر ملک میں گھوم پھر کر مضر اشیاء کی سپلائی کر رہے ہیں، ان کی وجہ سے معاشرے میں جو برا اثر پڑ رہا ہے وہ ناقابل بیان ہے۔

لہذا ان کو اپنے شہروں میں تلاش کیجئے، حملہ کر کے ان کو تباہ کر دیجیے، اپنے لوگوں اور بچوں کی حفاظت کیجئے، اور ان کے زہریلی فکر و عزائم کا تریاق بنئے۔ لوکل ڈرگ مافیاوں کو موت کے گھاٹ اتار دیجئے۔

یورپ پر صرف یورپیوں کا حق ہے :

''ہمارے دشمن کبھی نہیں چاہتے کہ ہم ان کی زمینوں کا حصہ بنیں، اسی لئے آئے دن مہاجرین کو تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے''۔

سرزمین یورپ سے حملہ آوروں کو ملک بدر کر دینا چاہیے، اس سے قطع نظر کہ وہ کہاں سے اور کب آئے؟ اور یہاں کیسے آباد ہوئے؟ چاہے وہ روما کے رہنے والے ہو یا افریقہ کے، چاہے ہندوستانی ہوں یا ترکی، سٹمیک ہوں یا کوئی اور، اگر وہ ہماری قوم سے نہیں ہیں لیکن ہماری زمینوں پر آباد ہیں تو ان سب کو نکال باہر کر دینا چاہیے۔

انہیں کہاں منتقل کیا جائے یہ ہماری ذمہ داری نہیں ہے، ہمیں تو بس اپنی زمینوں کو خالی کرنا ہے کیونکہ ہماری زمینیں ان کے جائے مسکن نہیں ہیں، وہ اپنی زمینوں پر واپس جا سکتے ہیں، یا کہیں اور اپنا آشیانہ بنا سکتے ہیں، لیکن ہماری زمینوں پر قبضہ نہیں کر سکتے ہیں۔

ان حملہ آوروں کو نکال باہر کرنے کے لئے چاہے جو طریقہ ممکن ہو، چاہے جو راستہ نکلے بہرحال انہیں نکال باہر کرنا ہے کیونکہ ان کو نکالے بغیر یورپ حقیقی معنوں میں اپنی حاکمیت اور خودمختاری قائم نہیں رکھ سکتا ہے۔

حملہ آوروں کو بھگاؤ، یورپ کو بچاؤ۔

آپ ایک اشارے کے منتظر ہیں جب کہ آپ کی قوم آپ کے اقدام کا انتظار کر رہی ہے۔

آپ منتظر ہیں ایک اشارے کے کہ کوئی ہتھیار اٹھائے، کوئی صدا لگائے، جب کہ آپ کی قوم آپ کے اقدام کی منتظر ہے۔

تم ہی لوگوں کی پکار ہو، حملہ آوروں کی طرف پہلے تمہیں ہی قدم بڑھانا ہے، ان سے مقابلے کے لئے پہلے تمہیں ہی نکلنا ہے، ان کے سینوں میں پہلے تمہیں ہی نیزہ بھونکنا ہے۔

اب انتظار کرنا بند کر دیجئے، آگے قدم بڑھایئے، کیونکہ تم ہی قوم کے قائد ہو، رہبری کرنا تمہارا ہی کام ہے، لہٰذا ہمت سے کام لیجئے، بزدلی کو قریب مت پھٹکنے دیجئے، آگے بڑھ کر جنگ کی شروعات کیجئے۔

اگر تم میرے اس پیغام کو پڑھ رہے ہو، تو تم ہی وہ پہلے قائد ہو، جس سے قوم کی فتح ہمکنار ہوگی، تم ہی وہ بہادر ہو، جس کو اپنی قوم اور اس کے مستقبل کے لیے لڑنا ہے۔

عوام میں بھی اب بیداری پیدا ہو رہی ہے، وہ بھی لڑنے کے لیے میدان میں آرہی ہے، اسکی رہبری کیجئے، وہ تمہاری اطاعت بجالائے گی۔ مجرموں کے سامنے اپنے جوہر اور سچی طاقت کا مظاہرہ کیجئے۔

آپ ایک اشارے کے منتظر ہیں، جب کہ آپ کی قوم آپ کے اقدام کا انتظار کر رہی ہے۔

قلت تعداد عقلمندی کی علامت نہیں ہے۔

اس پیراگراف سے اپنی قوم کو پیغام دیتا ہے کہ شرح پیدائش

میں اضافہ کریں، اور اپنی تعداد کو جتنی جلدی ممکن ہو، زیادہ کریں۔

''کہیں بھی ہو، جو لوگ اقلیت میں ہوتے ہیں ان پر ہمیشہ ظلم کیا جاتا ہے۔ اگر آپ سماجی، سیاسی اور نسلی اقلیت کا شکار ہوے تو آپ بھی ظلم کا نشانہ بنیں گے۔

اگر آپ سیاسی میدان میں پیچھے ہوتے ہیں، تو اکثریت کو کنٹرول کرنے کی طاقت کو کھو دیں گے، اصول و قانون بھی آپ کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے، جو عوام کی زندگی کے لیے فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ اگر آپ تہذیبی اعتبار سے اقلیت کا شکار ہوتے ہیں، تو آپ اپنی تمام چیزیں جیسے تاریخ، نظریات و خیالات اور آرٹ وغیرہ سے دور ہو جائیں گے، اور اپنے آپ کو تہذیب و ثقافت سے خالی پائیں گے۔ اگر آپ زبان دانی کے عتبار سے اقلیت میں ہوتے ہیں تو آپ کو آئے دن پریشانی اٹھانی پڑے گی، آپ کو میڈیا بھی الگ تھلگ ڈال دے گا، بزنس سے بھی الگ کر دیا جائے گا حتی کہ معاشرے کی گفت وشنید سے بھی علحدہ کر دیا جائے گا۔ اسی لئے اپنی زمینوں کو غیر ملکیوں سے پاک کیجئے اور اپنے آپ کو ہر اعتبار سے اکثریت میں لانے کی کوشش تیز کیجئے۔

اقلیتوں کے ساتھ کبھی بھی بہتر سلوک نہیں کیا جاتا ہے لہذا اقلیت کا شکار مت ہونا''۔

دشمن کو بے لگام مت چھوڑئے :

اگر آپ کو پتہ چل جائے کی آپ کے صحن میں زہریلے سانپ کا گھونسلا ہے، تو کیا آپ زہریلے سانپ کو اور اسکے نوعمر بچے کو یوں ہی آزاد چھوڑ دیں گے، یوں ہی آزاد اور کھلے ماحول میں پروان چڑھنے کی اجازت دے دیں گے تا کہ وہ ایک دن تمہارے صحن میں تمہارے ہی کھیلنے والے بچے کو ڈس سکے۔ نہیں! آپ ایسا نہیں کریں گے، بلکہ گھونسلے کو جلا کر خاکستر کر دیں گے اور زہریلے سانپ کو قتل کر دیں گے چاہے وہ عمر کے جس مرحلے میں ہو۔

اب حقیقت یہ ہے کہ ہماری سرزمینوں میں دشمنوں کی نسل میں دن بدن اضافہ ہو رہا ہے، ان کی شرح پیدائش بڑھ رہی ہے، آپ بھی اس سے واقف ہوں گے۔ یہی بچے ایک دن نوعمری کے مرحلے میں پہنچیں گے، پھر جوانی کی عمر میں، اسکے بعد یہی بچے ہمارے لوگوں کی مرضی کے خلاف ووٹ ڈالیں گے، حملہ آوروں کے مذہب اور ان کی تہذیب کو اپنائیں گے اور اسی پر عمل پیرا ہوں گے، ہمارے ہی لوگوں کی زمینوں، عہدوں اور گھروں کو چھین لیں گے غرض یہ کہ ہمارے ہی بچوں پر حملہ آور ہوں گے اور ان کا قتل عام کر کے صفایا کر دیں گے۔

ایک مشہور کہاوت ہے کہ'' پرہیز علاج سے بہتر ہے'' یا'' ایک بار کا پرہیز ہزاروں بار علاج کرانے سے بہتر ہوتا ہے''، لہذا ان دشمنوں کو جوانی کی دہلیز پر پہنچنے، قوت دفاع کے مرحلے میں داخل ہونے سے پہلے ختم کرنا بہت ضروری ہے، اگر آپ نے یہ جنگ جاری کر دی تو آپ کے بچے امن وامان کے ساتھ رہ سکیں گے۔

حالات سے قطع نظر، کچھ والدین ایسے ہیں جن کے لیے معاشی خوشحالی کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ اپنے بچوں کی زندگی کی خاطر خطرہ مول لے سکتے ہیں۔ اگر ہم نے صرف ایک بار اپنے دشمن کو اس کے بچوں کے سلسلے میں خطرہ کا احساس دلایا تو وہ ہماری زمینوں سے دور رہیں گے۔ یہ چیز ذرا ناگوار ہوگی، اپنی ہی زمین پر فساد کا سبب بنے گی۔ لیکن یاد رکھو! یہ سب ضروری ہے۔ آپ کسی بھی حملہ آور کو نہ چھوڑیں وہ عمر کے چاہے جس مرحلے میں ہو۔ ایک دن تمہارے لوگوں کو دشمن کا سامنا کرنا پڑے اس سے بہتر ہے کہ تم خود ان کا صفایا کر دو۔

اپنی جگہ پر رہ کر جنگ کیجیے :

شہروں پر توجہ دیجیے، اختلاف رائے پر نظر رکھیے، دشمن کی طرف بڑھئے اور اسکا ڈٹ کر مقابلہ کیجئے، بزدلی اور کم ہمتی کو قریب مت آنے دیجئے۔ اس کے لئے ہم وطن اور پڑوسی ممالک پہلے ہی سے ہمارا ساتھ دینے کے لئے تیار ہیں، جیسا کہ ہمیشہ دیتے رہے ہیں۔ پڑوسی ملکوں کے افراد پہلے ہی سے روایات کے حامی اور فطرت کے قریب ہیں، اور اپنے لوگوں کی حمایت کرتے رہتے ہیں۔

یہی وہ شہر ہیں جہاں محنت رنگ لاتی ہے، یہی وہ شہر ہیں جہاں حملہ آور جمع ہوتے ہیں، یہی وہ شہر ہیں جہاں مارکسزم

اداروں کو زہر آلود بناتے ہیں، یہی وہ شہر ہیں جہاں غدار، نمک حرام میڈیا اور کارپوریشن رہتے ہیں اور جہاں اینٹی وائٹ سیاستداں اور انجیو زا اپنا ٹھکانہ بناتے ہیں۔

اپنے شہروں کے دفاع کے لیے لڑئے، ان کو مکمل اپنے قبضہ میں کیجئے، کیونکہ ہمارے لوگوں کے لیے شہر ہی معاشی، عدالتی، سیاسی، نسلی اور تہذیبی گہوارہ ہیں اسی لئے ہمیں حملہ آوروں کے خلاف جنگ جاری رکھنا ہے۔

پڑوسی ممالک تو انتظار کر سکتے ہیں لیکن تم نہیں، تمہارے شہروں کو تمہاری ضرورت ہے، تمہارے نوجوانوں کو تمہاری ضرورت ہے، باوجودیکہ تم میں سے کتنے لوگ معاشرے میں آلود فضا اور تہذیبی گندگی کو محسوس کرتے ہیں، کشادہ شہروں میں تنگی کے ساتھ رہتے ہیں، لیکن یہی وہ مقامات ہیں، جہاں ہمارے مستقبل کی تقدیر بنے اور سنورے گی، جہاں اپنے لوگوں کے مستقبل کے لیے جنگ لڑی جائے گی۔

بنیادی حقوق کے حصول کے لیے شہروں کو دوبارہ حاصل کیجیے۔

نسلی ممالک کی مدد کیجئے :

جب ایک قوم یا ملک آگے بڑھتا ہے، تو آپ بھی ان کے ساتھ قدم بڑھایئے، ان کی مالی، سیاسی، سماجی اور جسمانی طور پر مدد کیجئے۔ کیوں کہ ہمارا دشمن ایک ملک کی چھوٹی تحریک کی ساکھ کو ختم کرسکتا ہے۔ لیکن جب سارے ممالک اور براعظموں کے یورپی لوگ اپنے بھائیوں کی مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، تو ہمارے دشمنوں کی یہ جرأت نہیں کہ وہ کسی ایک جماعت پر حملہ کرسکیں۔

اس تحریک کا آغاز پولینڈ ، آسٹریا، فرانس، ارجنٹیائن، آسٹریلیا، کناڈہ، اور وینزویلا میں ہوسکتا ہے۔ لیکن جب یہ تحریک شروع ہو تو اپنے لوگوں کی مدد کے لیے پوری قوت کے ساتھ تیار رہیئے۔

معاشی طور پر ان کی مدد کیجئے، ان کا مالی تعاون کیجئے، ان کے ساز و سامان کو خریدیئے، اپنے ذرائع و اسباب اور محنتوں کو رضا کارانہ طور پر ان کے لئے پیش کیجئے۔

سماجی طور پر ان کی مدد کیجئے، انکے منصوبوں کو سراہیئے، انکے ناقدین اور حریفوں پر ٹوٹ پڑئے، میڈیا اور روزمرہ کی گفتگو میں انکی مدافعت میں آواز بلند کیجئے، اور انٹرنیٹ پر تمام یورپی ممالک کو انکی مدد کیلئے ابھارئے۔

سیاسی طور پر ان کی مدد کیجئے، ان کے قائدین کی حمایت میں صدا لگایئے، ان کے نظریات اور انکے لوگوں کا ساتھ دیجئے، جو لابی ''lobby'' پاور میں ہیں ان کو بھی تمہارا سپورٹ کرنا چاہیئے، اور جو ممالک ان کی مدد کیلئے کھڑے نہیں ہوتے ہیں انکی ایمبیسیز کے باہر صدائے احتجاج بلند کرنا چاہیے، اگر اس سے کام نہ چلے تو ان پر حملہ کردینا چاہیے۔ اور جو منتخب قائدین تمہارے بھائیوں کی مدد کیلئے اپنی جان نچھاور کرتے ہیں، ان کی جسمانی طور پر مدد کیجئے، ان کے ساتھ اپنے قدموں کو جمائے رہیئے، زمینی سطح پر ان کے لئے کام کیجئے، ان کو سامان جنگ اور ہتھیار سپلائی کیجئے، ان کے دشمنوں پر ٹوٹ پڑئے، اگر ذرائع ابلاغ یا ریاست تمہارے خطے میں ان پر حملہ آور ہوں تو اس کے ذمہ دار کارپوریشن اور غدار، دھوکے باز سیاستدانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹادیجئے۔

اتحاد پیدا کیجئے، اور نسلی ممالک کی بھرپور مدد کیجئے۔

موت کو قبول کیجئے بدنامی کو گلے لگائیے :

موت یقینی شے ہے، چاہے آپ مقدس صلیبی جنگوں میں لڑتے ہوئے اس کو گلے لگائیں، یا ہوسپٹل میں دم توڑ دیں یا کسی بھی طریقے سے جان جائے لیکن موت و حیات کے بیچ اس مختصر سی زندگی میں اس کو کامیاب کیسے بنائیں یہ فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری زندگی کی قابلیت و اہمیت اس میں نہیں کہ تمہاری عمر لمبی ہو بلکہ اس کی قابلیت کا دارومدار تمہارے اپنے اعمال و افعال پر ہے۔ اب ذرا اپنے آپ سے پوچھیے کہ آپ نسلی ذمہ داریوں سے نجات یا پہلو تہی اختیار کرنا چاہتے ہیں، اپنے ہی لوگوں سے منہ موڑ لینا چاہتے ہیں، ان کی قربانیوں کی قدر و قیمت کیا آپ کی نظر میں نہیں ہے؟ کیا یہ سب اس لیے ہے کہ موت پر امن طریقے سے آئے۔ موت کو گلے لگائیں کیونکہ سورج کے ڈھلنے کی طرح مجھے یقین ہے کہ آپ موت کو گلے لگائیں گے، اور اپنی زندگی کو یوں ہی بیکار نہیں جانے دیں گے۔

بدنامی کو برداشت کیجئے، تمہاری قوم کے دشمن تم پر چاروں

طرف سے حملہ آور ہوں گے میڈیا تم کو ویلن ثابت کرے گی، ریاست تمہیں غدار قرار دے گی، عالمی طاقتیں تمہیں کرمنل، دھوکے باز اور انسانیت کا دشمن جیسے تمام ناموں سے موسوم کریں گیں لیکن جب تک اپنے مشن میں کامیاب نہ ہو جاؤ تب تک اس بدنامی کو خوشی خوشی اور مسکراتے ہوے برداشت کرتے رہو۔

موت کو گلے لگائیں، بدنامی کو برداشت کیجئے، فتح سے ہمکنار ہوئیں۔

جهان رنگ و بو کا خاتمه:

امریکہ جسے مختلف پھولوں کا گلدستہ کہا جاتا ہے یہاں پر برپا کی جانے والی خانہ جنگی کا اصل مقصد عالمی طاقتوں کا خاتمہ کرنا ہے اور مغربی یکساں طبقاتی نظام، انفرادیت پسندی اور عالمگیر ثقافت کا صفایا کرنا ہے۔

دنیا میں سب سے زیادہ امریکہ ہی میں نظریۂ مساوات کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے۔ ایک لمبی مدت تک یکساں طبقاتی نظام کی تجربہ گاہ امریکہ ہی کو بنایا گیا، لیکن ہماری خوش قسمتی ہے کہ نسلی امتیازات کے خاتمے کی کوشش، تہذیبی خصوصیات کو مٹانے کی جدوجہد اور لادینیت پسندی کی فکر کو عام کرنے کی کاوش دم توڑ چکی ہے۔

امریکہ تاریخ میں پہلی مرتبہ بحرانی کیفیت سے دوچار ہے، انتخابی جماعتیں ہر بار حملے کی زد میں رہتی ہیں، ریاستیں ایک دوسرے سے نفرت کر رہی ہیں، نسلیں آپس میں دست و گریباں ہیں، اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ دو سیاسی جماعتی نظام میں نسلوں کو، سماج کو، تہذیب کو، زبانوں کو اور طبقات کو تقسیم کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ قوم مخمصے کا شکار ہے، کسی چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتی، کوئی بڑی منصوبہ بندی کی استطاعت نہیں رکھتی، سماجی اور سیاسی طاقتوں نے تو ترقی کے پہیہ پر بریک لگا دیے ہیں۔

حالانکہ آبادیاتی تبدیلی کا دس ہزارٹن کا پتھر جب آگے بڑھتا ہے، رفتار پکڑتا ہے، تو اپنے راستے میں حائل ہونے والی رکاوٹوں کو چکنا چور کر دیتا ہے. آخر کار جب امریکا کے سفید فام کو حالات کا علم ہو جائے گا، جنگ کی آگ بھڑک اٹھے گی، اور بہت جلدی ریاست ٹیکسس کے اندر سفید فام نسل کا تبادلہ اپنے عروج پر پہنچ جائے گا اور ریاست ٹیکسس کے غیر سفید فام نسل کے سماجی اور سیاسی دھڑیں جمہوری فتح کی حمایت میں اکٹھا ہو جائیں گے اس طرح الیکشن کا سلسلہ یقینی ہو جائے گا۔

ایک یا دو الیکشن میں جمہوریت کی یقینی فتح کے بعد سے صرف وہی لوگ باقی رہ جائیں گے، جو جمہوری انداز میں ووٹ ڈالنے کے قائل نہیں ہیں، وہی سفید فام نسل رہ جائیگی جس کی تختی بالکل سادہ ہے، ان باقی ماندہ لوگوں کو اپنا مستقبل واضح نظر آجائیگا اور بہت جلد ہی سیاسی سفارتی میدان میں فتح کا امکان بالکل ختم ہو جائے گا اور پھر بہت جلد ہی سیاسی، سماجی اور نسلی فسادات کا آتش فشاں پھٹ پڑے گا۔

اس فسادات کے طوفان میں نسل اور ثقافت کی نیت سے سفید فام اور مغرب کے حامیوں کو اکٹھا کرنے کی زوردار کوشش ہوگی۔ اس طرح اتحاد و اتفاق کے بعد ریاستہائے متحدہ امریکا پر قبضہ کرنا ممکن ہو سکے گا، لہذا ہمیں فساد و تشدد کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

بس انتظار کرو وقت آنے کا، کوشش اپنی تیز کرو۔

اب رنگارنگ تہذیبوں اور نسلوں کی کہانی ختم ہو جانی چاہیے اور نظریۂ مساوات کے قصے کو پارینہ ہو جانا چاہئے۔

سبق لینے کی ضرورت:

حملہ آور کے اس نوٹ کو پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے دشمن کس سطح کی ہمارے خلاف محنتیں کر رہے ہیں، کس قسم کے منصوبے بنا رہے ہیں، ابھی بھی پرانی عداوتوں کو اپنے دلوں میں بٹھائے صلیبی جنگوں کو جاری رکھے ہوے ہیں، اور دوسری طرف ہم ہیں جو صرف اسلاف کی محنتوں اور کاوشوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوے ہیں، خود کچھ کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ کوئی لائحہ عمل طے کرنا نہیں چاہتے ہیں، اگر یہی صورت حال رہی تو ہمارا مستقبل خطرہ میں پڑ سکتا ہے، اور ہم مزید تنزلی کا شکار ہو سکتے ہیں، لہذا یہ وقت ہم پر آئے اس سے پہلے ہی ہمیں بیدار ہو جانا چاہیے، اور اپنی محنتوں کو تیز کر دینا چاہیے، اور اپنے تمام اداروں اور مراکز کو مضبوط اور مستحکم بنا لینا چاہیے، تاکہ آئندہ ہمارا کوئی بھی دشمن اس طرح کا انسانیت

❑ احوال عالم

چارلی ایبڈو اور مسجد نور

تحریر: سلیم عزوز

ترجمہ: محمد سہیل ندوی
استاذ: مدرسۃ العلوم الاسلامیہ، علی گڑھ

سوزحملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔

☆☆☆

جب چارلی ایبڈو دہشت گرد حملہ کا شکار ہوا تھا تو پوری دنیا کے قائدین وزعماء نے وہاں پہونچ کر اپنی حاضری درج کرائی تھی، ناک رگڑ کر پیرس پہونچے، اور اپنا احتجاج ومظاہرہ اس نعرہ کے ساتھ پیش کیا کہ ہم سب چارلی ایبڈو کے ساتھ ہیں، اور ان میں پیش پیش عالم اسلام کے قائد ورہنما محمود عباس اور ابو مازن تھے، جنھوں نے فرط جذبات میں صدر پیرس کو اپنے آغوش میں لے لیا، اور گود میں اٹھا لیا تھا، اور قریب تھا کہ بس ان کے احساسات وجذبات ان کے قلوب پر غالب آجائیں اور وہ تاب نہ لاسکیں، اور آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑے، اس پر جوش طریقہ سے انھوں نے مظاہرہ کیا کہ گویا وہ اس حادثہ کی زد میں آنے والے ہر فرد اور ہر شخص کو اس کے نام اور اس کی شکل سے پہچانتے ہوں، لیکن جب یہ تازہ المناک حادثہ نیوزلینڈ کی مسجد میں رونما ہوا، اور اسکی بھینٹ پچاس سے زائد بے قصور وبے گناہ نمازیوں کو چڑھا دیا گیا، تو اس پر کوئی کسی طرح کی اضطرابی وبے چینی سامنے نہیں آئی۔ اور ہم کو اس کا انتظار بھی نہیں ہے کہ ہمارے اس حادثہ کے ساتھ بھی وہی معاملہ ہو جو چارلی ایبڈو کے ساتھ ہوا تھا، وہاں پورے عالم اسلام کے قائدوں نے حاضری دی تھی، اور اپنے غم کا اظہار کیا تھا، تو وہ وہاں پر بھی آئیں۔

کیا یہ دوہرا ودوغلا پن اس لئے ہے کہ پہلے حادثہ میں مجرم مسلمان تھا، اور اس حادثہ کے بھینٹ چڑھنے والوں کا تعلق ''سلالہ نقیہ'' سے تھا، نہیں بلکہ انھوں نے اس وقت اسلام اور مسلمانوں کو اس حادثہ کا مورد الزام ٹھہرا کر ان کا استحصال کیا، اور وہ سیسی جیسے مجرم کے لئے ایک بہت عظیم اور سنہری موقع تھا، اور وہ زبردستی مغرب کی قربت چاہتا تھا، اور اسلام اور مسلمانوں پر دہشت گردی کا الزام ٹھہرا کر امریکن عوام کو اپنے اعتماد میں لینے کی تگ ودو میں مگن تھا، اور اس لئے جتن کر رہا تھا۔

اور وہ تمام مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیتا ہے، اور کسی بھی حادثہ وسانحہ میں اگر کوئی مسلمان اس میں پایا جائے تو وہ اس مسئلہ کو ہائی لائٹ کر کے دہشت گردی سے موسوم کرتا ہے، اور اسلام کو دہشت گردی سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے، اور اپنے جھوٹے اور کھوکھلے بے حیثیت و بے بنیاد نعروں اور دعووں کے ذریعہ مسلمانوں اور اسلام کی مخالفت کر کے یورپ کے عوام کی جھوٹی واہ واہی بٹورنے کا متمنی رہتا ہے۔

کہیں وہ اپنے بیان میں یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے کہ دین کی تفہیم و تشریح از سر نو اور نئے طریقہ سے پیش کی جائے، اور یہ بات اس نے اس کانفرنس میں کہی تھی جس کا عنوان یورپ کی سلامتی اور امن کا تحقق تھا، اور اس بات کو خوب تاکید کے ساتھ کہا کہ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہوگا جب تک غیر مسلموں کی خواہشات کے موافق نہ ہوجائے، اور اس کے پیچھے اس کا مقصد صرف اور صرف مسلمانوں کا نقصان ہے، جبکہ بظاہر اس کانفرنس کا عنوان امن تھا۔

اور اگر اب اس تازہ حادثہ کی طرف دیکھیں تو اس میں مجرم مسلمان نہیں تھا، اور نہ کوئی گرجا گھر تھا، اور نہ چارلی ایبدو تھا نہ

کوئی اور معاملہ تھا، جس کو دہشت گردوں کا نشانہ بنایا گیا ہو بلکہ اس حملہ کی نذر ہونے والے معصوم و بے گناہ جمعہ کے نمازی تھے، اور مجرم انتہا پسند عیسائی تھا، لیکن کسی بھی امن پسند تنظیم اور امن کا دعوی کرنے والے کی نظر اس عیسائی کے مذہب پر نہیں گئی۔

اور اس موقع پر اب مسیحی تعلیمات کو ذرہ برابر دوہرانے اور تذکیر کی ضرورت نہیں ہے، اور وہ عیسائی مجرم اپنے مسیحی رہنما کی تعلیمات سے بالکل بھی متاثر نہیں ہوا، اور نہ مسیحی تعلیمات اس کو اس حیوانیت اور درندگی سے بچا سکی، جو تمہارے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں رخسار بھی پیش کر دو، ہاں لیکن اس تعلیم کا مظاہرہ اس معنی میں ضرور ہو رہا ہے کہ میں سلامتی نہیں بلکہ تلوار اور درندگی کے ساتھ آیا ہوں۔ اور نیوزی لینڈ کے جرم کی یہ وجہ جواز نہیں ہے کہ تمام مسیحی رہنماؤں اور مسیحیت سے تعلق رکھنے والوں کو اس حادثہ میں ملوث ٹھہرایا جائے، اور بغیر کسی تفریق کے اس حادثہ کا ذمہ دار پوری مسیحی دنیا کو ٹھہرایا جائے، جیسا کہ سیسی کا کردار رہا ہے، کوئی بھی حادثہ اور سانحہ پیش آئے جس میں کسی مسلم کا نام ہو تو اس کو وہ اس کے مذہب سے اس کی تعلیمات سے اور اسلام سے جوڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن افسوس اب اس حادثہ پر نہ کوئی نعرے بلند ہوں گے، اور نہ مذہبی دہشت گردی کے نعرے لگائیں جائیں گے، اور نہ اس انتہا پسند عیسائی مجرم کی دینی اور مذہبی حیثیت کو پرکھا جائے گا اور نہ اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی، کہ اس کا تعلق کہاں سے تھا؟، وہ کس مکتبہ فکر سے منسلک تھا؟، اس کا روحانی اور مذہبی پیشوا کون تھا؟ الغرض کسی بھی طرح کی کوئی تحقیق نہیں کی جائے گی، اور نہ اب تک کسی بھی دینی مسیحی تنظیم نے کوئی معذرت خواہی کی، اور نہ بابا فاتیکان کی طرف سے کوئی نوٹس لیا گیا، کیا اس طریقہ کی انتہا پسندی اور عصبیت کے الفاظ کسی قاموس اور ڈکشنری میں پائے جاتے ہیں؟ یا ان کے مسیحی روحانی رہنماؤں کے یہاں اس کی تعلیم ملتی ہے؟

حالانکہ اس حادثہ کی جائے وقوع تو مسجد تھی، امن کا گہوارہ تھا، بے قصور نمازی تھے، انھوں نے کسی تنظیم کے خلاف کوئی بات کہی تھی، اور نہ ان کی طرف سے کوئی ایسا عمل سرزد ہوا جو فضا کو مکدر اور گدلا کرتا ہو، نہ ان کی طرف سے کسی دوسرے مذہب سے تعلق رکھنے والے کے ساتھ کوئی نازیبا و ناشائستہ حرکت سرزد ہوئی، ان تمام باتوں کے باوجود بھی عبادت خانہ کو مذبح خانہ سے تبدیل کر دیا گیا، اور خون کی ہولی کھیلی گئی، پانی سے ارزاں خون سمجھا گیا، کیا ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے؟ ان کا تعلق اسلام سے تھا؟ وہ اسلامی تعلیمات کے پیروکار اور متبعین تھے؟

اور نہ اس حادثہ کو روکنے کے لئے کوئی امن پسند دعویٰ کرنے والی تنظیم وہاں پہونچی اور نہ کسی امن کا دعویٰ کرنیوالے سیاسی لیڈر کا سکوت ٹوٹا، اور نہ اس انتہا پسندی کے آڑے کوئی اور امن کا دعویدار آیا۔

کیا یہ انتہا پسندی اور دہشت گردی نہیں ہے؟ کیا یہ اسلام دشمنی اور عصبیت نہیں ہے؟ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مجرم کو پکڑا جاتا اور اس پر سزائیں بھی مقرر کی جاتیں۔ لیکن نہیں ہوا، نہ ہم چارلی ایبڈو ہیں، اور نہ ہمارے لئے چارلی ایبڈو ہونا مناسب ہے۔ اور نہ یہ ہمارا موضوع ہے، یہاں پر جرم ذاتی ہے، تو اس کی سزا بھی ذاتی ہونی چاہیے، چارلی ایبڈو کے موقع سے جس طرح پورے عالم اسلام کی تنظیموں نے عذر خواہی کی تھی، اب مسیحی دنیا بھی عذر خواہی کرے، اور جائے حادثہ پر پہونچے۔

دنیا کے کسی مسیحی لیڈر نے اور نہ عالم اسلام کے کسی لیڈر نے ہمارے مقتولین اور شہداء کی تعزیت کی، تعزیت تو دور یورپ اپنے آپ کو عذر خواہی کا مستحق نہیں سمجھ رہا ہے، اور اس حادثہ کے بعد عیسائی مسیحی تنظیموں کو ذرا برابر بھی شرم نہیں ہے چہ جائیکہ ان کا نعرہ ہو کہ ہم مسجد نور کے ساتھ ہیں۔

کیا عالم عرب کا کوئی قائد اس بات کی جرأت و ہمت رکھتا ہے کہ وہ آج بھی اسی طرح تڑپ جائے اور بے چین ہو جائے جس طرح وہ چارلی ایبڈو کے ساتھ تھا۔

ہرگز اس بات کی ان کو جرأت و ہمت نہیں ہے، ان کا خون سفید ہو چکا ہے، شرم کا پانی مر چکا ہے۔

تعارف و تبصرہ

☆☆☆

نام کتاب: ہندو محققین کا مطالعہ قرآن وسیرت

مصنف: ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی

صفحات: ۱۴۴

طبع اول: جولائی ۲۰۱۸ء

ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

زیر نظر کتاب اپنے حجم کے اعتبار سے مختصر مگر مواد و موضوع کے اعتبار سے بڑی اہم ہے، اس کو سو فیصد ''بقامت کہتر بقیمت بہتر'' کا مصداق قرار دیا جاسکتا ہے، مصنف گرامی قدر نے اسلام کی حقانیت کو ایک ایسے دور میں ہندو محققین کے قلم سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس دور میں امت مسلمہ اور اس کے علماء و دانشوران اپنی داعیانہ حیثیت کو بھول گئے، نتیجہ یہ ہوا کہ مایوسی و بائے عام بن گئی، بہت سے بے چاروں کا اسلام پر اعتماد ہی متزلزل ہونے لگا، گذشتہ چار پانچ سالوں میں فسطائیت کے لہراتے ہوئے پھریرے نے اس میں مزید اضافہ کیا ہے، ان حالات میں اسلام کی حقانیت، اس کی ابدیت، اس کے شکوک وشبہات سے ماوراء ہونے، اس کی کتاب حق کے وحی الٰہی ہونے، اس کے رسول برحق کے برحق و افضل ہونے اور اسلام کے فلسفۂ اخلاق کے مثالی ہونے کو پیش کرنے کے لئے انھوں نے جو طریقہ اختیار کیا، وہ خوب ہے، قابل قدر و لائق صد ستائش ہے۔

اس مختصر سی کتاب کی خصوصیات یہ ہیں کہ اس کا اسلوب علمی ہے، اس میں معروضی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، تجزیہ و تبصرہ سے گریز نہیں کیا گیا ہے، تعصّبات سے مکمل احتراز برتا گیا ہے، وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا گیا مگر علمیت کا دامن نہیں چھوڑا گیا، کتاب کو حشو و زائد سے پاک رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، ہندو محققین کے صرف اعترافات کو ہی نہیں نقل کیا گیا ہے، بلکہ ان کے اعتراضات پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

ظاہر ہے کہ ہندوؤں میں ہر قسم کے لوگ رہے ہیں، بعض وہ رہے ہیں جنھوں نے دل کھول کر قرآن کی حقانیت پر گفتگو کی ہے، پیغمبر اسلام کی ذات کو انسانیت کی معراج کمال قرار دیا ہے، ایسے بھی رہے ہیں جنہوں نے زہر آلود و تعصب آمیز تحریروں سے انسانی معاشرہ میں زہر گھولنے کا کام کیا ہے، ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے قرآن مجید کی کامیاب ترجمانی کی کوشش کی ہے، نعتیہ شاعری میں تو ہندو نعت گو شعرا کا پورا ایک دبستان ہے، ہندو اہل قلم میں ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے اسلام کا مطالعہ انسانیت کے فروغ کے لیے کیا اور دنیا کو اسلام اور مسلمانوں سے دوستی کی دعوت دی اور ایسے بھی ہیں جن کا مطالعہ اسلام محض اسلام دشمنی پر مبنی رہا، ایسے لوگ بھی ہیں جو اعترافات پر رک گئے اور بعض ایسے بھی ہیں جو قبولِ حق تک پہنچ گئے، ڈاکٹر فلاحی نے اس کتاب میں ان تمام پہلوؤں سے بڑی قیمتی اور جامع معلومات فراہم کردی ہیں، ظاہر ہے کہ اس مختصر کتاب میں تراجم قرآن، تفہیم قرآن، اسلامی تعلیمات، سیرت رسول اور اسلامی اخلاقیات سے متعلق ہر زمانہ میں ہوئی ہندو محققین کی کوششوں کا احاطہ تو نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس کتاب کو اس حیثیت سے نمائندہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس میں موضوعی لحاظ سے نمائندہ شخصیات و کاوشوں پر عمدہ تبصرہ کیا گیا ہے، کتاب کی تصنیف کا بنیادی مقصد ہندو مسلم اذہان کی تقریب، اور تفہیم اسلام ہے، یہ ایک داعیانہ کوشش ہے، کتاب میں اس دعوتی پہلو کا خاص خیال رکھا گیا ہے، اگرچہ اس کے پیش نظر علمیت و موضوعیت سے کہیں تنازل نہیں اختیار کیا گیا ہے، مصنف نے درحقیقت بڑی حقیقت پسندانہ کوشش کی ہے، آپ ان کے اس ایک جملہ سے اندازہ کرسکتے ہیں ''قرآن مجید کے تئیں ہندو محققین کے نتائج فکر حوصلہ افزا بھی ہیں اور حوصلہ

شکن بھی'' (ص۳۳) اس کے آگے کی ان کی سطریں جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہیں اور امت سے اس کے اصل کردار کا مطالبہ کرتی ہیں، اگر اس پوری کتاب سے خلاصہ بحث کے طور پر یہی چند سطریں سامنے رکھی جائیں تو بھی مصنف کی کوشش کو کامیاب و بامراد قرار دیا جائے گا اور ان کا صد ہزار بار شکریہ ادا کیا جائے گا، وہ لکھتے ہیں:

''امت مسلمہ ایک داعی گروہ ہے، برصغیر کے تناظر میں برادرانِ وطن اس بات کے مستحق ہیں کہ کتاب الٰہی سے انھیں متعارف کرایا جائے، اس مطالعہ کے ذریعہ یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ترسیل وتبلیغ کے سلسلے میں امت مسلمہ غفلت کا شکار رہی ہے، کسی ایک ہندو دانش ور نے بھی تحدیث نعمت کے طور پر اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ اس کے کسی مسلمان پڑوسی یا مبلغ نے پیغام الٰہی کو اس تک پہنچایا۔ چنانچہ بات اعتراف حقیقت تک تو پہنچی، قبول حق کے اکا دکا واقعات بھی ظہور پذیر ہوئے لیکن برادرانِ وطن کے عمومی شعور میں تبدیلی نہیں آئی۔ ان کے سامنے صالح لٹریچر اور عملی نمونہ پیش نہیں کیا گیا'' (ص۳۴)

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے، باب اول میں ''ہندو محققین کے مطالعہ قرآن مجید کو پیش کیا گیا ہے، پہلے تین مستقل تصنیفات کو موضوع گفتگو بنایا گیا ہے، پھر پانچ غیر مستقل تصنیفات کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، اس کے بعد ''حاصل بحث'' کے عنوان سے انتہائی فکر انگیز نکات تحریر کیے گئے ہیں، پھر حواشی وتعلیقات کی فہرست درج ہے، ٹھیک اسی طرح باب دوم میں ''مطالعہ سیرت پر برادران وطن کی خدمات'' کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، اس باب میں تین مستقل اور دس غیر مستقل کتب کا تجزیہ کیا گیا ہے، تیسرے باب میں ''ہندو اہل علم کی سیرت نگاری'' کو موضوع بنایا گیا ہے، یہاں بھی تین مکمل تصانیف اور چار غیر مستقل کتب کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے، اسی باب میں ایک عنوان ''ہندو اہل علم کی ہندی سیرت نگاری'' قائم کیا گیا ہے، اس کو نثر ونظم دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، نثر کے حصہ میں چار اور منظوم حصے میں دو کتب کا تذکرہ ہے، اسی باب میں ایک عنوان ''ہندو نعت گو شعراء کی اردو تخلیقات'' ہے، جو صرف تذکرہ برائے تذکرہ ہے، ورنہ اس عنوان پر ضخیم کتاب کی ضرورت ہے، بلکہ نور میرٹھی کا تیار کردہ ضخیم تذکرہ موجود بھی ہے، مصنف نے بقدر ضرورت تذکرہ پر اکتفا کی ہے، یہاں ''نومسلموں کے تاثرات'' بھی ذکر کیے گئے ہیں، اس کے بعد آخری باب میں ''اسلامی فلسفۂ اخلاق پر ہندو اہل علم کی آرا'' کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے، جو اس کتاب کا بہت اہم حصہ ہے، اس کے مطالعہ سے دعوتی گفتگو اور اسلام کی تفہیم میں بڑی مدد مل سکتی ہے، اگرچہ مصنف نے آخر میں علیٰحدہ ''ہندو محققین کے اعتراضات واعترافات'' کا ایک خاکہ بھی پیش کر دیا ہے۔

پوری کتاب کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے، کہ مصنف نے بری تگ ودو اور سینکڑوں مراجع کا مطالعہ کر کے یہ بہترین مرقع پیش کیا ہے، جس پر ان کو جس قدر مبارکباد پیش کی جائے، کم ہے، کیوں کہ یہ کتاب ایک طرف علمی ضرورت پوری کرتی ہے تو دوسری طرف دعوتی تقاضوں کے لیے نئی راہیں متعین کرتی ہے، اور اسلام کی تفہیم کے لیے خاطر خواہ مواد فراہم کرتی ہے، امید ہے کہ اس کی ان خصوصیات کے پیش نظر اہل علم اس کا بھرپور استقبال کریں گے۔

☆

نام کتاب: قرآن کا تصور عروج وزوال
(عصر حاضر کے خصوصی تناظر میں)
مرتب: ابوسعد اعظمی
صفحات: ۳۰۴
ناشر: ہدایت پبلشر اینڈ ڈسٹری بیوٹرس، دہلی
ملنے کے پتے: ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ،
مرکزی مکتبہ اسلامی، نئی دہلی۔
مبصر: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

زیر نظر کتاب دراصل ادارہ علوم القرآن علی گڑھ میں ۲۰۱۷ء میں منعقد ہوئے سیمینار کے مقالات کا مجموعہ ہے، جس میں مختلف موضوعات پر ۱۸ مقالات شامل ہیں، جو سب کے سب سیمینار کے مرکزی موضوع ''قرآن کا تصور وعروج وزوال-عصر حاضر کے

خصوصی تناظر میں‘‘۔ سے متعلق ہیں۔

عروج وزوال ایک ایسی ناقابل انکار حقیقت ہے جس سے کسی صاحب علم کو انکار کی جرأت نہیں، قرآن نے انتہائی وضاحت کے ساتھ عروج کی رہنمائی کی ہے اور زوال سے متنبہ کیا ہے، قصص القرآن کے آئینہ میں قرآن مجید کا فلسفۂ عروج وزوال خوب واضح ہوجاتا ہے، قرآنی تعلیمات کی مرجعیت بالیقین اسباب عروج میں سرفہرست ہے اور ان سے فرار واعراض زوال کی بنیادی وجہ ہے، صاحب قرآن محمد عربی علیہ السلام نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس امر کی وضاحت کردی ہے إن اللہ یرفع بھذا القرآن ویضع بہ آخرین ،قرآن مجید نے جابجا عمل کی دعوت اسی لیے دی ہے کہ امتِ قرآن کو زوال سے بچایا جائے اور عروج وکمالات سے ہمکنار کیا جائے۔

ادارۂ علوم القرآن علی گڑھ کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ رجوع الی القرآن، تدبر فی القرآن اور عمل بالقرآن کی دعوت دیتا ہے، اس کے بعض نظریات سے کس کو اختلاف ہوتو اس کی بھرپور گنجائش ہے، مگر اس کے بیشتر اقدامات جو قرآن مجید سے امت مسلمہ کے تعلق کو استوار ومضبوط کرنے کے لیے کیے جاتے ہیں، یقیناً وہ قابل قدر اور لائق صد ستائش ہیں، عہد حاضر میں عالمی منظر نامہ کے پیش نظر مسلمان اپنی تاریخ کے جس بدترین دور سے گزر رہے ہیں، اس میں اس طرح کے موضوع کو زیر بحث لانا غیر معمولی اقدام ہے، اس موضوع کا تعلق خود احتسابی، عمل بالقرآن، رجوع إلی القرآن اور امت میں بیداری پیدا کرنے کی اقدامی کوشش سے ہے، کاش کہ اس سیمینار کی علمی کوشش کو عملی تحریک میں تبدیل کرنے پر بھی غور کیا جاتا، اس لیے کہ آج بھی روئے زمین کے طول وعرض پر قائم متعدد ادارے قرآن کو بحث ونظر اور فکر وتدبر کا موضوع بنائے ہوئے ہیں، اس کے مختلف الجہات فلسفوں پر تحقیقات وبحثیں ہورہی ہیں، مگر اس پر عمل، اس کی تعلیمات کا نفاذ جو فی الحقیقت ضمانِ عروج ہے، وہ ندارد، تشنہ اور مفقود ہے۔

تصور عروج وزوال کی بحث پرانی ہے، قرآنی اور ایمانی نقطۂ نظر سے یا تاریخی حوالوں کے تناظر میں اس پر خوب بحثیں ہوئی ہیں، علمائے اسلام نے بھی اس موضوع کو چھیڑ کر امت کو مہمیز کرنے کا کام کیا ہے، اور مستشرقین نے بھی اس موضوع پر خامہ فرسائی کی ہے، امام غزالی، ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ جیسے نوابغ روزگار نے اس فلسفہ پر روشنی ڈالی ہے، عہد حاضر میں محمد الغزالی، سید قطب، امیر شکیب ارسلان، مولانا مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے مسلمانوں کے عروج وزوال سے بحث کی ہے، قرآن مجید اور بالخصوص اس کا وہ حصہ جو تذکیر بایام اللہ سے عبارت ہے اسی فلسفہ کو سمجھاتا اور واضح کرتا ہے، قرآن نے بہت وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الأعلون إن کنتم مومنین (آل عمران:۱۳۹) (ترجمہ:تم لوگ بزدل اور کمزور نہ پڑو، اور نہ رنج وغم کے شکار ہو، تم اگر مومن ہوتو تم ہی برتر ہو) اب اگر ایمان کی شرط اور اس کے تقاضے پورے کیے بغیر عمل کو شیوۂ زندگی بنائے بغیر، انفرادی واجتماعی زندگی کو قرآنی لائحہ عمل کا تابع بنائے بغیر کوئی نقطۂ عروج کی انتہا کیا اس کی ابتدا کی بھی امید کرے تو اس کو مایوسی ہی ہاتھ لگے گی اور وہ عہد حاضر کے ’’متفکرین‘‘ کی طرح یہ کہتا پھرے گا کہ: ’’قرآن عروج کا کوئی یونیک تصور نہیں پیش کرتا‘‘، حالانکہ قرآن سے زیادہ جامع ومکمل اور آسان وقابل عمل تصورِ عروج وکمال کسی نے پیش ہی نہیں کیا، قرآن کہتا ہے إنما ذلکم الشیطان یخوف أولیاء ہ فلا تخافوھم وخافون إن کنتم مومنین (آل عمران:۱۷۵) (ترجمہ:وہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں اور چیلوں کو (ان باتوں سے) ڈراتا ہے، (اے مسلمانو) تم ان سے مت ڈرنا، اور اگر تمہارے اندر ایمان ہے تو بس مجھ سے ڈرو)۔ وعلی اللہ فتوکلوا إن کنتم مومنین (مائدہ:۲۳) (ترجمہ: اور اللہ پر بھروسہ رکھو اگر تمہیں اس پر ایمان ہے)۔ فاللہ أحق أن تخشوہ إن کنتم مومنین (التوبہ:۱۳) (ترجمہ: اللہ اس کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے ڈرو، اگر تم صاحب ایمان ہو)۔ إن اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیر واما باأنفسھم (رعد:۱۱) (ترجمہ:اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنے حالات نہیں بدلتے)۔ ایمان وعمل کی مزید وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے ولقد کتبنا

فی الزبور من بعد الذکر أن الأرض یرثها عبادی الصالحون (الانبیاء:۱۰۵) (ترجمہ:اور ہم نے نصیحتوں کے بعد زبور میں لکھ دیا تھا کہ زمین کی وراثت (اقتدار اعلیٰ اور خلافت ارضی) میرے بندوں میں سے ان کو ملے گی جو نیک اور صالح اور باصلاحیت اور اہل ہوں گے) تصور عروج کی وضاحت اور عروج کے لیے شرائط، غلبہ واستحکام کے تقاضوں کو آئینہ کی صورت میں پیش کرتے ہوئے قرآن کا ارشاد ہے وعد الله الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الأرض کما استخلف الذین من قبلهم و لیمکن لهم دینهم الذی ارتضی لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم أمنا، یعبدوننی لا یشرکون بی شیئا، ومن کفر بعد ذلك فأولئك هم الفاسقون (النور:۵۵) (ترجمہ:اللہ نے ایمان والوں اور نیک عمل کرنے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں ضرور خلافت سے نوازے گا، جس طرح ان سے پہلے (اہل حق) کو خلافت دی، اور ان کے دین کو جس کو ان کے لئے پسند فرمایا ہے اقتدار عطا کرے گا، اور ان کی خوف اور بدامنی (کی حالت) کو امن وسلامتی سے بدل دے گا، (ان پر ذمہ داری ہے) کہ وہ میری عبادت کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور جو بھی اس کے بعد کفر کریں گے، وہ باغی اور سرکش ہوں گے)۔

ان آیات میں عروج کا جو چارٹر دیا گیا ہے، اس کو نکات کی شکل میں لکھ لیں، "بعیدوننی" کی گہرائی ووسعت اور ہمہ جہتی کا اندازہ کرلیں "ولا یشرکون بی شیئا" کی باریکیوں کا جائزہ لے لیں، "ویسلموا تسلیما" کے مطالبہ خود سپردگی پر غور کرلیں، عروج وغلبہ اور استحکام کی شرط ایمان وعمل صالح اور اعداد قوت کا جائزہ لے لیں تو بات صاف ہوجائے گی، کہ قرآن نے عروج کا جو تصور پیش کیا ہے، زوال کے جو قصے سنائے ہیں ان کی روشنی میں ہم کہاں کھڑے ہیں، قرآن کے اسی فلسفہ کی مختلف الجہات توجیہ و تشریح اس مجموعہ مقالات میں کی گئی ہے، اس بحث میں پیدا ہونے والے متعدد اعتراضات کا جواب بھی اس کتاب میں تسلی بخش مل جاتا ہے، مثلاً ظالموں کے عروج کی کیا توجیہ ہوسکتی ہے، اس حوالے سے کتاب میں ایک مقالہ موجود ہے، قرآن نے کن کن امور کو عروج وزوال سے مربوط کیا ہے، اس کی اچھی خاصی توضیح اس میں کی گئی ہے، ایمان کے تقاضوں، اعمال صالحہ، اعداد وقوت اور تحریک اصلاح کو قرآن کے تصور عروج کے طور پر پیش کیا گیا ہے، ہندستانی اور مغربی مفکرین کے تصور عروج وزوال کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے، مجموعہ میں شامل تمام ہی مقالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں، بالخصوص مولانا علاء الدین ندوی کا مقالہ "قرآن کریم میں عروج وزوال کا تصور" بڑا قیمتی ہے، اس مقالہ میں تفصیل سے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کی گئی ہے، مقالہ کی ابتدا میں ایک ملفوظ کے ذریعہ اس کا خلاصہ پیش کردیا گیا ہے، یہ ملفوظ درحقیقت قرآن کے تصور عروج وزوال کی مختصر وجامع تشریح معلوم ہوتا ہے!!

"جب تم کفار کو عروج پر دیکھو تو سمجھ لو کہ انھوں نے مسلمانوں کی صفات اپنالی ہیں، اور جب مسلمانوں کو پستی میں دیکھو تو جان لو کہ انھوں نے کفار کی خصلتوں کو اپنا لیا ہے" (کتاب ہذا، ص۹۰)

قرآن کریم کا اس پہلو سے مطالعہ کیا جائے تو وہی حقیقت سامنے آئے گی جو اس مختصر اقتباس میں بیان کی گئی ہے، تاریخ تہذیب اسلامی اور تمدن مغرب کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو بھی یہی نتیجہ نکلے گا، مسلمانوں کے دور عروج واقبال اور عہد ظلمت وزوال کا مطالعہ کیا جائے تو بھی یہی حقیقت مجسم سامنے آئے گی۔

ضرورت ہے کہ اس عہد میں اس موضوع کو مزید عام کیا جائے، اور اس حوالے سے لوگوں کو مطالعہ قرآن کی دعوت دی جائے، عمل بالقرآن پر ابھارا جائے، ادارہ علوم القرآن کی کاوشیں اس پہلو سے بہت خوش آئند ہیں، یہ مجموعہ مقالات ادارہ کے ذمہ داران اور مرتب عزیز کی ان ہی عملی کوششوں کا نتیجہ ہے جس کا اہل علم کو خاطر خواہ استقبال کرنا چاہیے، اس کے مشمولات کا مزید علمی جائزہ لینا چاہیے اور کم از کم اس کے عملی پیغام کا انفرادی اور خاندانی سطح پر نفاذ کرنا چاہیے، یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے انتہائی اہم ہے، اس کی اشاعت بھی بہت اہتمام سے کی گئی ہے، کتاب کی ظاہری کشش نہ صرف کتاب خریدنے پر آمادہ کرتی ہے بلکہ مطالعہ کے لیے بھی مہمیز کرتی ہے، اس کی

اشاعت میں اس پہلو کا خاص خیال رکھا گیا ہے، البتہ پروف اور ایڈیٹنگ کی بعض کمیاں جا بجا نظر آئیں، کبھی کبھی ایسی کمی بھی رہ جاتی ہے جس سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے جیسے ایک جگہ حواشی میں فی ظلال القرآن کی کتابت فی ضلال القرآن ہوگئی ہے، اس پہلو پر توجہ عہد حاضر میں بہت کم ہوتی جارہی ہے، راقم سطور خود بھی اس پہلو سے غفلت کا شکار ہے۔

☆

نام کتاب: مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی حیات وعلمی خدمات

مرتب: الحاج اخلاص احمد شروانی

صفحات: ۵۴۰

ناشر: یونیورسل بک ہاؤس، علی گڑھ

ملنے کے پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، علی گڑھ، دانش محل لکھنؤ

مبصر: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

زیر نظر کتاب ایک تاریخ ساز وعہد ساز شخصیت کے تعارف و تذکرہ سے عبارت ہے، اس میں شروانی صاحب کی حیات کے مختلف گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، ان کے خاندانی حالات کا بھی ذکر آ گیا ہے، ان کے معاصرین، احباب و متعلقین اور ناموران قلم کے مضامین بھی اس میں جمع کر دیے گئے ہیں، اس کتاب کی اشاعت کے لیے اخلاص احمد شروانی صاحب لائق صد مبارکباد ہیں جو عمر کے اس حصہ میں بھی اس طرح کے علمی کام انجام دے رہے ہیں، اپنی شبانہ روز کوششوں کے ذریعہ اسلاف میں سے ان شخصیات کے تذکرہ کو حدیث مجالس بنا دینا چاہتے ہیں جن کی شخصیت مثالی، ہمہ جہت اور ہشت پہل تھی، ملک وملت کے لیے جن کا تذکرہ مفید اور علم وتعلیم کے میدان میں جن کا ذکر چراغ راہ ہے، یقیناً اخلاص صاحب نے اس شعر کی معنویت کو زندہ کیا ہے ؎

نام نیکو رفتگاں ضایع مکن
تا بہ ماند نام نیکد برقرار

بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اخلاص احمد صاحب تصنیف وتالیف کے میدان میں ماہر نہیں، بلکہ وہ اس میدان کے آدمی ہی نہیں، مگر جذبہ صادق کسی بھی انسان سے کوئی بھی کام کرالیتا ہے، اخلاص صاحب کئی کتب ترتیب دے چکے ہیں، جو محض ان کے جنون عمل و اور قوت فکر کا نتیجہ ہیں، ورنہ ان کی اپنی تحریروں میں جملوں کی ساخت، کتاب کی ترتیب اور عبارت کے نظم ونسق میں نقص صاف نظر آتا ہے، اس کتاب میں بھی جو صفحہ ان کے قلم سے ہے وہ اس تناظر میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے، ساتھ ہی کتاب کی ترتیب میں بھی یہ بات دیکھی جاسکتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کتاب نواب صدر یار جنگ پر موسوعاتی Encyclopedic طرز کی کتاب ہے، اس میں ان کی حیات وخدمات، خاندانی حالات، شخصی خصوصیات، معاصرین سے تعلقات، مختلف تحریکات و اداروں سے ان کی وابستگی کا بڑا عمدہ تذکرہ آ گیا ہے، وہ بانیان ندوۃ العلماء میں تھے، بہی خواہان مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تھے، دینیات فیکلٹی کی عمارت ان کی کوششوں کا منہ بولتا ثبوت ہے، وہ دارالمصنفین کے صدر تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے ان کا تعلق تھا، عثمانیہ یونیورسٹی کے بانی وسربراہ تھے، دارالترجمہ اور دائرۃ المعارف سے ان کا خاص تعلق تھا، دارالعلوم دیوبند سے ان کی راہ ورسم تھی، یہ سب تفصیلات اس کتاب میں آ گئی ہیں، اسی طرح جن شخصیات سے ان کو قربت رہی، جن سے ان کے بے تکلف اور بے حجابانہ تعلقات رہے ان سب کی تفصیلات بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

مرتب کتاب نے بہت سے دفینوں سے تلاش تلاش کر اس کتاب میں معلومات یکجا کی ہیں، مختلف کتب ورسائل سے مشاہیر اہل علم کے مضامین لے کر ایک حسین گلدستہ تیار کر دیا ہے، یہ در اصل ایک طرف اس شخصیت کو بہترین خراج عقیدت ہے جو متضاد صفات کی حامل یکتائے روزگار تھی، دوسری طرف یہ کتاب عہد حاضر میں سبوتاز ہوتی ہوئی مشرقی تہذیب کو سنوارنے، نئی نسل کو اخلاق وکردار کا سبق دینے، قومی وملی شعور بیدار کرنے کی بھی ایک عمدہ کوشش ہے، اس کتاب کو پڑھتے ہوئے زبان پر یہ شعر بے ساختہ آجاتا ہے ؎

فغاں میں، آہ میں، فریاد میں، شیون میں نالے میں
سناؤں درد دل طاقت اگر ہو سننے والے میں

مولانا شروانی غمخوار قوم، ہمدرد ملت اور بہی خواہ انسانیت تھے، وہ ایک متقی و پرہیز گار متدین و روشن خیال عالم دین تھے، ان کی روشن خیالی میں بانیان ندوۃ العلماء اور سرسید احمد خاں کی ملاقاتوں کا اثر تھا۔

نواب صدر یار جنگ نوابوں میں ایک ایسی منفرد شخصیت کے مالک تھے جس کی مثال کم ملتی ہے، وہ اپنی علمیت، ادبیت اور تقوی و تدین کے لیے مشہور تھے، ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کوئی بہت بڑا رئیس ہو، ریاست کا کاروبار بھی سنبھالتا ہو اور علمی نکتہ سنجی میں بھی مہارت رکھتا ہو، تقویٰ و تدین میں بھی اپنی مثال آپ ہو، مولانا شروانی رئیس بھی تھے، عالم بھی تھے، کتاب خواں بھی تھے، کتابوں کے خزانے کے مالک بھی، وہ عربی کے عالم، فارسی کے ذوق شناس، انگریزی سے واقف اور اردو کے صاحب طرز ادیب تھے، شروانی صاحب کی علم دوستی اور علم و اہل علم کی سرپرستی، انصاف پسندی، اخلاقی جرأت اور نمود و نمائش سے نفرت قابل تعریف تھی، وہ نہ صرف متضاد خصوصیات کے جامع تھے بلکہ ان کی شخصیت میں عقل و دل کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔

سخاوت، فقاہت، ادبیت، مروت وغیرہ ان کی قابل تقلید صفات تھیں، وہ باوجود رئیس ہونے کے مشرقی اقدار و روایات اور اسلامی تہذیب و تعلیم کی پاسداری میں قابلِ تقلید نمونہ تھے، علم و عمل، فضل و کمال دینداری و تقویٰ شعاری کا پیکر تھے، ان کی قابلِ ذکر خصوصیات یہ تھیں کہ وہ اپنی ۸۶ سالہ عمر میں سے تقریباً ۶۰ سال کسی نہ کسی پہلو سے قومی زندگی سے وابستہ رہے، اس کا ذکر ایک ایسے دور میں انتہائی ضروری ہے جبکہ نفسانفسی کا عالم ہے، خاندانی شیرازہ تک بکھر چکا ہے، اجتماعی زندگی مطلب پرستی کی بھینٹ چڑھ چکی ہے، عہد حاضر کا یہ فلسفہ ہر سمت نظر آتا ہے کہ ''کھاؤ، کماؤ اور اپنے گھر میں محدود اپنی زندگی گذار کے چلے جاؤ'' آج آدمی کی سوچ اتنی محدود ہوگئی ہے کہ وہ اپنی گاڑی، اپنا بنگلہ، اپنی نوکری اور اپنے پیٹ سے آگے کچھ سوچ ہی نہیں پاتا۔

نواب صدر یار جنگ کی شخصیت کا دوسرا تابناک پہلو یہ تھا جس کا تذکرہ اس دور میں بے حد ضروری ہے کہ وہ کسی ایک طبقہ، کسی ایک مکتب فکر سے تعلق نہ رکھتے تھے، ان کا تعلق سب سے تھا، وہ ہر جگہ نمایاں نظر آتے تھے، خیر میں سب کے معاون بنتے تھے، ندوہ، دیوبند، دارالمصنفین، مسلم یونیورسٹی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور حیدرآباد کے مناصب سے بیک وقت ان کی وابستگی اس کی واضح دلیل ہے۔

ایسی ہشت پہل شخصیت کا جامع تذکرہ مرتب کر کے اخلاص شروانی صاحب نے اہل علم پر احسان کیا ہے، ضرورت ہے کہ ہماری نئی نسل ان مردان کار و باصفا کی حیات و خدمات کا مطالعہ کرے، اور بلندی کردار کا سبق ان سے حاصل کرے، یہ کتاب ضخیم ہے مگر مولانا شروانی کی شخصیت کی ضخامت اس سے زیادہ کی متقاضی ہے، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات پر قرض ہے کہ وہ مولانا شروانی کی حیات و خدمات کو نمایاں کرے، ان پر پی ایچ ڈی ہوسکتی ہے، نواب صدر یار جنگ میموریل لیکچر کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے، اس سلسلہ میں ندوۃ العلماء کی طرف سے بھی مزید اقدامات کیے جا سکتے ہیں، اگر چہ ندوہ نے احسان شناسی کا ثبوت دیا ہے، مولانا شروانی پر بہت پہلے وہاں سے ایک کتاب شائع ہوئی تھی، ابھی نو تعمیر شدہ ایک ہاسٹل ''رواق حبیب'' سے موسوم کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں مولانا علی میاں ندویؒ کی کتاب ''پرانے چراغ'' سے مولانا شروانی پر ان کا بڑا طاقتور مضمون بھی شامل کر لیا گیا ہے، جی چاہتا ہے کہ اسی کے ایک اقتباس پر اس تبصرہ کو تمام کروں، جو کہ مولانا شروانی کے متنوع کمالات، متضاد خصوصیات اور جامع جہات شخصیت پر روشنی ڈالنے کے لیے کافی ہے، مولانا علی میاں لکھتے ہیں:

''میں نے اپنے طویل سفروں اور لوگوں سے تعلقات میں ہر طرح کے اہل کمال دیکھے ہیں، میں نے اہل علم کو دیکھا، اہل دین کو بھی دیکھا، ادیبوں اور شاعروں سے بھی ملا، لیکن میں نے ان جیسا متضاد صفات کا جامع اور متنوع شخصیت کا حامل نہیں دیکھا، وہ حلقۂ امراء میں امیر، دبستان ادباء میں ادیب، طبقہ شعراء میں شاعر، مصنفین کی دنیا میں مصنف، ناقدوں کی صف میں ناقد و مبصر اور ماہرین تعلیم کی محفل میں ایک ماہر تعلیم تھے، اور جب کسی محفل میں یہ سب جمع ہوتے تو صدر محفل اور صدر انجمن ہوتے اور لوگ پروانہ وار

آخری صفحہ

احسان کی تعریف اور اس کا صحیح مفہوم

(م۔ق۔ن)

انھیں گھیر لیتے، ان سے رجوع کرتے اور امیر مجلس بناتے''۔

☆☆☆

حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلیفۂ اجل ڈاکٹر محمد عبدالحئ عارفی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں ایک دن ایک صاحب آئے اور آکر بڑے فخریہ انداز میں خوشی کے ساتھ کہنے لگے کہ اللہ کا شکر ہے کہ مجھے ''احسان'' کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔''احسان'' ایک بڑا درجہ ہے جس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے کہ:

"أن تعبد الله كأنك تراه فان لم تكن تراه فانه يراك" (بخاری کتاب الایمان)۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کر کہ تو اللہ کو دیکھ رہا ہے اور اگر یہ نہ ہو سکے تو کم از کم اس خیال کے ساتھ عبادت کر کہ اللہ تعالیٰ تجھے دیکھ رہے ہیں، اس کو ''درجۂ احسان'' کہا جاتا ہے، ان صاحب نے حضرت والا سے کہا کہ مجھے ''احسان'' کا درجہ حاصل ہوگیا ہے، ڈاکٹر عارفی صاحبؒ نے ان کو مبارک دی اور فرمایا: یہ تو بہت بڑی نعمت ہے، البتہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں کہ کیا آپ کو یہ ''احسان'' کا درجہ صرف نماز میں حاصل ہوتا ہے، اور جب بیوی بچوں کے ساتھ معاملات کرتے ہو اس وقت بھی حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟ یعنی بیوی بچوں کے ساتھ معاملات کرتے وقت بھی آپ کو یہ خیال آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں؟ یا یہ خیال اس وقت نہیں آتا؟ وہ صاحب جواب میں کہنے لگے کہ حدیث میں تو یہ آیا ہے کہ جب عبادت کرے تو اس طرح عبادت کر گویا کہ اللہ کو دیکھ رہا ہے، یا اللہ تعالیٰ اس کو دیکھ رہے ہیں، وہ تو صرف عبادت میں ہے ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ''احسان'' کا تعلق صرف نماز سے ہے، دوسری چیزوں کے ساتھ احسان کا کوئی تعلق نہیں، حضرت عارفی صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے اسی لئے آپ سے یہ سوال کیا تھا، اس لئے کہ آج کل عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ''احسان'' صرف نماز ہی میں مطلوب ہے یا ذکر و تلاوت ہی میں مطلوب ہے حالانکہ احسان ہر وقت مطلوب ہے، زندگی کے ہر مرحلے اور شعبے میں مطلوب ہے، دکان پر بیٹھ کر تجارت کر رہے ہو وہاں پر بھی احسان مطلوب ہے۔ یعنی دل میں یہ استحضار ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، جب اپنے ماتحتوں کے ساتھ معاملات کر رہے ہو اس وقت بھی ''احسان'' مطلوب ہے، جب بیوی بچوں اور دوست واحباب اور پڑوسیوں اور دوستوں سے معاملات کر رہے ہو، اس وقت بھی یہ استحضار ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے دیکھ رہے ہیں، حقیقت میں ''احسان'' کا مرتبہ یہ ہے، صرف نماز تک محدود نہیں ہے۔

اس واقعہ سے یہ حقیقت بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی تعلیم ہماری زندگی کے ہر شعبے کے ساتھ ہے، خواہ وہ عبادت ہو معاشرت ہو، معاملات ہو معاشیات واقتصادیات ہو یا حقوق اللہ اور حقوق العباد کا کوئی بھی شعبہ اور گوشہ ہو۔

لہٰذا ضرورت ہے کہ ہم اپنی زندگی کے ہر شعبے اور مرحلے میں ''احسان'' کا وہ مقام حاصل کرنے کی سعی وکوشش کریں، جو شریعت میں مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو احسان کے